

دلا

(طنز و مزاح)

تاج یہی ہے زیست کا حاصل
شوقِ تبسم دیدہ گریاں

A CC. No.

586

فاطمہ تاج

جملہ حقوق بہ حق مصنف محفوظ ہیں

تاریخ و سن اشاعت: ۱۵ دسمبر ۱۹۹۳ء

تعداد اشاعت: ۵۰۰

قیمت: ۳۰/- روپے

طباعت: اعجاز پرنٹنگ پریس، چھتہ بازار - حیدرآباد

ناشر: فاطمہ تاج

پتہ: ۳۳۹ - ۳ - ۲۲، ملکہ باؤلی - میرچوک

حیدرآباد - ۵۰۰۰۰۲

کتاب ملنے کے پتے:-

* حسامی بک ڈپو - مچھلی کمان - پتھر گٹی - حیدرآباد

* الکتاب - گن فاونڈری - حیدرآباد

* مصنف - ۳۳۹ - ۳ - ۲۲، ملکہ باؤلی - میرچوک

حیدرآباد - ۵۰۰۰۰۲



انتساب

586

تاج کے سرتاج کے نام

جو حبیب احمد بالفقیہ

کے نام سے جانے جاتے ہیں



فاطمہ تاج

ترتیب و ترمین

صفحہ نمبر

- ۶ - ہمیش لفظ — ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال
- ۱۰ - اردو طرافت کے میدان میں ایک اور آواز — رفیعہ منظور الامین
- ۱۲ - فاطمہ تاج کی بے ساختہ تحریریں — پروفیسر حبیب ضیاء
- ۱۵ - اعتبارِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے — فاطمہ تاج
- مضامین:

- ۱۸ - خواجہ میری تلاش میں ہے —
- ۲۲ - ہمیں بھی حشر کی سوجھی —
- ۲۶ - بیکہ اُتر گیا —
- ۲۹ - ہم نے بھی لڈو پائے —
- ۳۱ - "سیاست" (آخری سیاست) —
- ۳۶ - دورِ ترقی اور ہم —
- ۴۰ - ہم اور چھارے وہ —
- ۴۴ - آج کل —
- ۴۶ - اخبار اور ہم —
- ۵۰ - تنگ آنے کے آخر —

- ۵۴ _____ ہم اور ہمارے ڈاکٹر
- ۵۸ _____ جن پر قابو پانے کے بعد
- ۶۳ _____ تہذیب کے اڈے
- ۶۷ _____ سامنا پانی کی قلت کا
- ۷۰ _____ ہم اور مکھی
- ۷۳ _____ کرفیو
- ۷۶ _____ ضرورت ہے ... ؟
- ۷۹ _____ دوستوں نے بھی کیا کمی کی ہے
- ۸۴ _____ ہم اور آئینہ
- ۸۷ _____ موسموں کا مزاج
- ۹۰ _____ ایک شام ہماری بھی
- ۹۲ _____ موسم گرما اور ہم
- ۹۵ _____ ہم نے بھی عید منائی
- ۹۸ _____ لب ڈب
- ۱۰۱ _____ دورِ زماں ہمارا
- ۱۰۴ _____ ہنستے رہتے
- ۱۰۸ _____ نیند ہماری
- ۱۱۱ _____ ہنسی آتی ہے
- ۱۱۳ _____ ہنسی کی قیمت
- ۱۱۶ _____ جب ہم اناؤنسر بن جائیں گے
- ۱۱۸ _____ بے عمل
- ۱۱۹ _____ لہجہ



پیش لفظ

طنز و مزاح کے فروغ کے لئے حیدرآباد نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں ان میں خواتین کا حصہ قابلِ قدر بھی ہے اور یہ وقتاً بھی۔ آزادی سے قبل آصف جہاں بیگم اور جہاں بانو تقویٰ اور بعد میں زینت ساجدہ نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اس لطیف رجحان کی لطافتوں پر "صنفِ کثیف" کی اجارہ داری قائم ہوتے نہیں دی۔ گل افشانی گفتار کی اس روایت پر عمل کرتے ہوئے فاطمہ عالم علی خاں، ڈاکٹر رشید ہوسوی، ڈاکٹر لطیف صلاح، ڈاکٹر حبیب ضیاء اور بعض دوسری خوش دل خاتون ایہوں نے اپنی کاوشوں کے ذریعہ طنز و مزاح کی زلفیں ستھرائیں۔ مزاح کی گھنیری زلفوں تلے، وقت کی تیشی دھوپ کے مسافروں نے اپنی ابلہ پائی کو بھول کر آسودگی محسوس کی۔ حیدرآباد طنز و مزاح کا مرکزِ نقل بن گیا۔ طنز و مزاح کا کاروان آگے بڑھتا گیا اور پھر اس کاروان میں ایک اور خاتون فاطمہ تاج شامل ہو گئیں۔ جن کی مختلف النوع نثری و شاعری تخلیقات پے درپے اخباروں اور رسالوں کی زینت بنتے لگیں۔

عام طور پر نئے ادیب یا شاعر بتدریج شہرت کے منازل طے کرتے ہیں لیکن فاطمہ تاج حیدرآباد کے ادبی اُفق پر اچانک نمودار ہوئیں۔ ان کی تحریر کی دلکشی نے ادب کے قاری کو حیرت زدہ کیا۔ ان کی نگارشات سے صرف نظر ممکن نہ تھا کہ ان میں تنوع، گہرائی و گیرائی کے ساتھ زبان کی چمکانی بھی ہے۔ پتہ چلا کہ طالب علمی کے گزرمیں فاطمہ تاج کو ادب کا چمک تھا۔ لیکن وقت نے برسوں اس آگ کو دبا مے رکھا اور جب سوتے اہل پڑے، باندھو ٹوٹ گیا تو

تخلیق کار کی آوازیں نے گویا بالِ عناق کو جلا کر رکھ دیا۔ کبھی قفس تھا اور ماتم بالِ دیرگاہ اور پھر یوں ہوا کہ یکے بعد دیگرے شاعری، افسانوں اور مضامین کے مجموعے منظر عام پر آئے اور اب فاطمہ تاج کے مزاحیہ مضامین اشاعت پذیر ہیں۔

فاطمہ تاج کی شاعری اور نثر دونوں کے اوصاف جدا گانہ ہیں۔ ان کی شاعری رنج و الم سے عبارت ہے۔ "زمیت کو شاواں نہ کر سکنے" کا انھیں شدید احساس ہے۔

شاعری میں "چشمِ پُرِ نم سے ماحول کو آبِ حیدہ دیکھنے" والی فاطمہ تاج اپنے مضامین میں اپنی ہی اجتماعی طور پر سماج کی (خرومیوں پر قہقہہ زن نظر آتی ہیں۔ ان ہی کا شعر ہے یہ ہم قہقہہ زن اپنی ہی محو میوں پہ ہیں

اس طرح آرزو کو نمنا کر رہے ہیں ہم

فاطمہ تاج کے مضامین تازگی، شوخی و بندہ بستگی کا مرقع ہیں۔ انھوں نے مزاح کو سطحی انداز میں نہیں برتا۔ ان کا غم، شرارہ بن کر رگ و پے میں اترتا اور ٹوک ب قلم سے کبھی طنز اور کبھی ہلکے، مزاح کی صورت میں عیاں ہوتا ہے۔ کرشن چندر نے کہا تھا کہ "مزاح نگار ادب کے صدف میں ایک آنسو کو منجھ کر کے اسے دُور آیدار بناتا ہے اور ہنسی کی پرتوں میں ٹٹول ٹٹول کر آنسوؤں کی نرمی، گہری اور تیزی ڈھونڈنا مہذب قاری کا کام ہے۔

ماضی کا مزاح جو بیشتر جاگیردارانہ نظام کا پروردہ تھا۔ جذباتِ افتخار کے خمیر سے اٹھا تھا۔ اس لئے اُس دور کے مزاح کی حدیں تمسخر سے جا ملتی ہیں۔ آج کا شائستہ مزاح "تو ہنسنا ہے کو ہنسنا ہے مگر دل گہرا ہے" کی تفسیر ہے۔

فاطمہ تاج کے مزاج میں اُسی کیفیت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔
 حسری مزاج میں جذبہ افتخار کی جگہ ہمدردی کے جذبہ نے لے لی ہے۔ خواتین
 میں ہمدردی کا جذبہ کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ وہ دُر اسی کچی، نا انصافی یا
 ظلم برداشت نہیں کر پاتیں۔ آنکھ اشکبار ہو جاتی ہے۔ ہمدردی کی
 اس لہر میں نرمی ہو، رواداری ہو تو مزاج کے راستے کھل جاتے ہیں
 اور غصہ، احتجاج، جھجھلاہٹ یا راہ راست پر لانے کی کوشش طنز
 کی صورت اختیار کرتی ہے۔

فاطمہ تاج نے بڑے خشک، سبک اور شیریں انداز میں مختلف موضوعات
 پر قلم اٹھایا ہے۔ انہوں نے اس کتاب کا نام ”دلاس“ رکھا ہے۔ گویا
 ان کے مضامین محض ہمدردی کا اظہار نہیں بلکہ ایک قدم آگے بڑھ
 کر دلاس بھی دیتی ہیں۔

فاطمہ تاج کے مضامین کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہر طرح
 کے موضوع پر لکھنے کی قدرت رکھتی ہیں۔ اخبار ”سیاست“ پر لکھا ہوا ان کا
 مضمون اس کی بہترین مثال ہے۔ زبان نہایت سہل، دل کو چھونے والی،
 غیر ضروری ثقیل الفاظ و تراکیب سے عاری، چھوٹے چھوٹے پنے تلے جملے، لہجہ میں
 شگفتگی، خیالات میں روانی ہے۔ جن پر فکر کی دبیز تہہ چڑھی ہوئی ہے۔

فاطمہ تاج شعر بھی کہتی ہیں۔ افسانے، خاکے، رپورٹاژ اور نثر جانے
 کیا کچھ لکھتی ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ شاعر کی حیثیت سے شاعروں کے ہجوم
 اور شاعری کی دنیا میں وہ کھو نہ جائیں۔ جب کہ وہ اپنے مزاج

کی مناسبت سے اردو طنز و مزاح کی کائنات میں رنگ بھر سکتی ہیں۔
 میں "دلاس" کی اشاعت پر فاطمہ تاج کو دلی مبارکباد
 پیش کرتا ہوں اور مستقبل کے لئے ان سے بہتر توقعات وابستہ کرتا ہوں۔

ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

یکم دسمبر ۱۹۶۳ء

مدیر "شکوہ" و صدر شعبہ اردو انوار العلوم کالج =

حیدرآباد



اُردو ظرافت کے میدان میں ایک اور سہ آواز

فاطمہ تاج کو اپنی تحریر پر قدرت حاصل ہے۔ وہ ایک تباہناک شعور کی مالک ہیں۔ ایک جگہ لکھتی ہیں۔

”اندھیری رات ہی میں تو چراغ جلانے کی تمنا ہوتی ہے اور دُور

ملک پھیلے ہوئے اندھیرے پر ایک چراغ کی روشنی غالب آجاتی ہے“

شعور کا یہ نور انہوں نے کہاں سے حاصل کیا، اس پر مجھے اپنے شوہر منظور الامین

صاحب کے دو شعر یاد آئے۔

سینہٴ انسل کے اندر ہی نہاں وہ طُور ہے

واہو چشمِ دل تو پیدا معرفت کا نور ہے

دل کے اندر ہی تو ملتا ہے سراغِ زندگی

اس نہاں خانے میں جلتا ہے چراغِ زندگی

— خود آگہی کی مندرل ملک وہ اسی طرح تو پہنچی ہیں۔

زیرِ نظر ”دلاسہ“، ایک گلدستہ ہے جس میں بہت سارے خوش نما اور

خوش رنگ پھول ہیں، جن کی ہلک پڑھنے والوں کے ذہن و دل میں رچ بس جاتی ہے

ان شوقیوں اور شوخ نگارشوں کی مصنفہ فاطمہ تاج بحیثیت ادیب و شاعر

محتاج تعارف نہیں۔

کہتے ہیں گفتگو میں مزاح کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو کھانے میں نمک کو ہوتا ہے۔ بات میں جب ظرافت کی پیماشنی ہوتی ہے تو بات، بات کہی جاسکتی ہے۔ کچھ ایسی ہی غریب صورت اور خوشگوار باتوں کے حامل ہیں فاطمہ تاج کے یہ مضامین۔ ان کے یہاں آپ کو مزاح اور طنز کا ایک اچھا امتزاج ملے گا۔ اس میدان میں بقول انہیں کے انہوں نے کچھ "تجربات" کرنے کی غرض سے قدم رکھا ہے۔ یہ ایک نیک فال ہے۔ فن میں جب بھی تجربے کئے جائیں تو ان کا خیر مقدم کرنا چاہیئے۔ لہذا ان چند لفظوں کے ساتھ اُردو ظرافت کے میدان میں فاطمہ تاج کو میں خوش آمدید کہتی ہوں۔

(بنجارہ ہلز۔ حیدرآباد)

۱۵ نومبر ۱۹۹۳ء



فاطمہ تاج کی بے ساختہ تحریریں

فاطمہ تاج کا شمار حمید آباد کی ان خواتین میں کیا جاسکتا ہے، جنہوں نے بہت کم عرصے میں اپنا ایک منفرد مقام بنا لیا ہے۔ حمید آبادیوں کیلئے ان کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ اخبار سیاست اور محفل خواتین کے ذریعے انہوں نے اپنی شناخت بنائی۔ وہ ہر یک وقت ایک کامیاب افسانہ نگار بھی ہیں اور باصلاحیت شاعر بھی، اور اب ان کے مزاحیہ مضامین کا یہ مجموعہ زیور طبع سے آراستہ ہو کر قارئین سے دلاؤ تحسین چاہتا ہے۔

اس مجموعے میں (۱۳۲) مضامین شامل ہیں۔ مضامین کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ عام موضوعات سے ہٹ کر لکھے گئے ہیں۔ طنز و مزاح لکھنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ یہ وہ صلاحیت ہے جو خدا داد ہوتی ہے۔ فاطمہ تاج کے مضامین پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مزاح لکھنے کی ان میں فطری صلاحیت ہے۔ موضوع کے انتخاب میں انہیں کسی قسم کی دقت پیش نہیں آتی۔ وہ موضوع کا انتخاب اپنے ہی اطراف و اکناف کے ماحول سے کرتی ہیں۔ روانی اور تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے ایک ہی نشست میں اپنا مضمون مکمل کر لیتی ہیں۔

زیر نظر مجموعے ”دلاسہ“ کے کئی مضامین ایسے ہیں جو قاری کو دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ بعض مضامین خالص مزاحیہ ہیں اور بعض میں مزاح کے ساتھ طنز کے نشتر

بھی ملتے ہیں۔

فاطمہ تاج کو زبان پر کامل عبور حاصل ہے۔ افسانہ نگاری میں انہوں نے اپنی بہترین صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ مضمون "خزانہ میری تلاش میں ہے" کے چند جملے ملاحظہ ہوں۔

"ہم نے سنگھار میز کے آئینے میں نہ صرف اپنا سراپا خود اعتمادی سے دیکھا، بلکہ اُن آنکھوں کو بے ساختہ باجم لیا جو شدت خوف و غم سے بہتے لگی تھیں۔ نور کی یہ برسات اتنی شدید تھی کہ ہمارے دل سے عاشقانہ مزاج رکھنے والے "جن" کا خیال بھی بہہ گیا۔ ہم کو آیتہ الکرسی بھی یاد آچکی تھی۔"

طنز و مزاح سے بھرپور ایک مضمون "ہم اور ہمارے ڈاکٹر" ہے۔ اس میں انہوں نے ڈاکٹروں کی مشترکہ خصوصیات کا تذکرہ بڑے دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ ڈاکٹروں کے بارے میں لکھتی ہیں۔

"ہمیں یہ مسیحاں آج تک سمجھ میں نہیں آئی کہ ہم چاہے کوئی بھی تکلیف بیان کریں، ڈاکٹر پہلے خوش رہنے کی تاکید کرتے ہیں اور بعد میں دوائیں تجویز کرتے ہیں۔ پھر اس کے بعد کچھ پرہیز کی بھی ہدایت کرتے ہیں۔"

"ہندیب کے انڈے" بھی طنزیہ کی بہترین مثال ہے۔ مشرقی اور مغربی ہندیب کا موازنہ خوب ہے۔ مضمون کے چند جملے ملاحظہ ہوں۔

"غفر نے کہا، پہلے اسمیٹ بنے گا یا پڈنگ؟ ہم نے کہا،

پہلے آملیٹ پھر پڈنگ۔ تو بولے خدا بھلا کرے انگریزوں کا جو
 آملیٹ اور پڈنگ تو سکھا گئے مگر خوش اخلاق مرغی کی وہ نسل
 اپنے ساتھ لے گئے جو تہذیب کے انڈے دیا کرتی تھی۔ اور ہم اُس
 زمانہ میں آملیٹ یا پڈنگ کے ہرگز عادی نہ تھے۔ ہم مشرقی
 انداز میں بیسنے والے لوگ مشرقی کھانے ہی کھایا کرتے ہیں۔ آج کل
 تو ہماری تہذیب کا سہرچ مغرب سے نکلنے لگا ہے اس لئے تہذیب کے
 انڈے مل نہیں پا رہے ۔۔۔۔“

ان مضامین کے علاوہ ”دلاسہ“ میں طنز و مزاح سے ہنر پور اور بھی
 مضامین ٹھیس گئے۔ اس مجموعے کی اشاعت پر میں فاطمہ تاج کو دلی مبارکباد دیتی
 ہوں، اور اُمید کرتی ہوں کہ وہ خوب سے خوب تر کی طرف رواں دواں رہیں گی۔

ڈاکٹر جمیب ضیاء

۸ مارچ ۱۹۹۳ء

پروفیسر شفیق اردو

یونیورسٹی کالج فار ویمن جامعہ عثمانیہ



”اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے“

پھر بھی یقین ہے کہ کہیں نہ کہیں قارئین کو میری تحریر پر ”مسکراہٹ“ کا سامنا کرنا ہی پڑے گا۔ قارئین نے سمجھا ہو گا کہ میں شعروادب کا میدان چھوڑ چکی ہوں جی، نہیں! سہ

”ہم نے اپنے جی میں ٹھٹھانی اور ہے“

قطعی طور پر یہ فیصلہ کر چکی ہوں کہ ادب کی زمین کا کوئی بھی گوشہ میں خالی نہیں چھوڑوں گی۔ سخن نگاری، افسانہ نگاری، تبصرو نگاری، طنز و مزاح، شاعری، غرض کہ میں اپنی نگارشات کے ڈھیر لگا دوں گی۔ چاہے سامعین کی سمجھ خراشی ہو یا قارئین کا ذہن الجھ کر رہ جائے، مجھے پرواہ نہیں، کیونکہ یہ قارئین کرام ہی کی مسلسل حوصلہ افزائیوں کا ہی نتیجہ ہے تا!

میں برسوں سے سب کی تخلیقات پڑھے جارہی ہوں، پڑھے جارہی ہوں۔

آخر مجھ پر بھی مطالعہ کے اثرات نمایاں ہوں گے کہ نہیں۔۔۔۔؟

مجھے خود خبر نہیں کہ میں نے طنز و مزاح کی راہوں پر کس طرح قدم رکھا،

لیکن یہ بات تو ثابت ہے کہ طنز و مزاح انسان کی فطرت کا جز ہے، ہے نایاب اب اگر میں کچھ تجربات کرتے پر آمادہ ہوں تو کسی کو بھی اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔۔۔۔!

ویسے بھی شرمی وہ رنگین نقاب ہے جسے غم کے سیاہ پیکر پر اگر ڈالا جائے تو چہرہ غم بھی حسین لگتا ہے۔ اندھیری رات میں ہی تو چراغ جلانے کی تمنا ہوتی ہے اور اور تک پھیلے ہوئے اندھیرے پر ایک چراغ کی روشنی غالب آجاتی ہے، آتی ہے تاہم زندگی میری نظر میں اُس شاداب گلشن کی طرح ہے جس کی گتھیاں کرتے کرتے باغیاں کے ہاتھ نہ صرف زخمی ہو جاتے ہیں بلکہ نظروں میں بھی "کھٹ" محسوس ہونے لگتی ہے۔ کھلے ہوئے تروتازہ پھول دیکھ کر باغیاں یہ بھی جانتا ہے کہ وہ زخمی ہے۔ !

ادب میں اسی لئے طنز و مزاح کا بہت اہم مقام ہے کہ مطالعہ کے شوقین لوگ طنز و مزاح سے ہمیشہ لطف اندوز ہوتے ہیں۔ سنجیدہ اور تین لوگوں کے چہرے پر لمحہ بھر کی مسکراہٹ عرصہ حیات میں اضافہ کر ہی دیتا ہے۔

بہر حال نئے نئے تجربے کرنا مجھے پسند ہے، سو میں کرتی رہتی ہوں۔ قارئین کرام سے گتہ اترتا ہے کہ طوعاً و کرہاً ہی ہمیں میرا "دلّاس" قبول فرمائیں۔

کسی کے غم کو کم کہنا میرے تو بس کی بات ہے ہی نہیں، مگر میں عادتاً دوسروں کو نہ کہتا ہوں دیکھنا پسند کرتی ہوں، یہ کیا کہ ہر طرف آنسوؤں کے دھارے ہوں، آہوں کی آندھیاں ہوں، کبھی تو موسم بدلا ہوا نظر آنا چاہیئے، کہیں تو نسیمِ سب کی مسکراہٹ گل کھلاتی نظر آئے، غم کی جاودانی تسلیم! لیکن عارضی لمحوں میں ہنسنے مسکرانے سے کبھی گریز نہیں کرنا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ نے فطرت کے سنجیدہ و ہنجیدہ گوشوں میں بھی شرمیوں کے گلے دتے سجھائے ہیں۔ اسی گلے دتے کے ہر پھول کے رنگ سے اس کی خوشبو سے مستفید ہونا چاہتی ہوں اور سب کے لئے بھی وہی پسند کرتی ہوں جو اپنے

لئے پسند کرتی ہوں۔ جو لوگ شوخی فطرت پر سنجیدگی سے غور نہیں کرتے وہ حدوت کی عطا کی ہوئی سرور بخش کیفیت سے محروم رہتے ہیں۔

شعری مجموعہ ”اب کے برس“ پھر افسانوں کا مجموعہ ”آس پاس“ اور پھر ایلی مضامین کا مجموعہ ”امانت“ کے بعد اب ”دلاسہ“ پیش خدمت ہے۔ حسب سابق اس کتاب کی بھی اشاعت کا مرحلہ میٹر بھائی (صلاح الدین خیر) کے تعاون اور محنت سے ہی طے ہوا۔ مجھے تو بس لکھنا آتا ہے، سو لکھ دیتی ہوں، نیٹر بھائی کے تعاون کی جہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ خدا انہیں صحت و سلامتی عطا فرمائے اور حسب روایت ان کی حوصلہ افزائی، تعاون اور رہنمائی ہمیشہ مجھے حاصل رہے۔ آمین۔

میں ان ہر بانہستوں، محترمہ رفیعہ منظور الامین صاحبہ، محترم ڈاکٹر مصطفیٰ صاحب اور محترم پروفیسر حبیب ضیاء صاحبہ کی بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے اس کتاب پر اظہار خیال کرتے ہوئے اپنا قیمتی وقت مجھے دیا اور مجھے اپنی غلصہ سازائے سے نوازا۔

فاطمہ تاج

۲۵ نومبر ۱۹۹۳ء



”خزانہ میری تلاش میں ہے“

یقین کیجئے، میں کسی خزانے وزانے کی تلاش میں ہرگز نہیں ہوں بلکہ خزانہ میری تلاش میں ہے۔ آپ میری دماغی حالت پر بخدا شک نہ کیجئے۔ میں آپ کو ساری روداد سناتی ہوں۔

ہوا یوں کہ کچھ دن پہلے سرشام ہم گھر کے قریب والے ہاسپٹل جا رہے تھے۔ ایک موٹر پر مخالف سمت سے ایک ’باریش بزرگ‘ نے ہمارے سامنے آکر راستہ روک دیا۔ ہم نے نظر اٹھائی تو وہ بزرگ یوں گویا ہوئے۔ ”تیری آنکھوں پر رحمن عاشق ہوا ہی چاہتا ہے اور تجھے خزانہ بھی دینے والا ہے۔ وہ عنقریب تجھے

ملنے والا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ صاحب تیز رفتاری سے ہمارے آگے نکل گئے اور ہم من من بھر کے قدم اٹھاتے ہوئے ٹھاکڑ کے پاس پہنچے۔ نہ جانے خشک لگے اور کاپٹے ہونٹوں سے کیا کیفیت بیان کی کہ نیند کی گولیاں تجویز کی گئیں، جنھیں لے کر ہم لڑکھڑاتے قدموں سے گھر لوٹ آئے اور ذرا سنبھلتے ہوئے اُن ”بزرگ صاحب“ کے بیان پر غور کرنے لگے۔ اس کے بعد گھر کے کادر وازہ بسند کر کے ہم زندگی میں

یہی بار آئیے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی ان آنکھوں کا بغور جائزہ لینے لگے جن میں ابھی تک اُمیدوں کی شمعیں روشن تھیں۔ ہم بڑی دیر تک اپنی آنکھوں میں دیکھتے رہے اور سوچتے رہے کہ آخر ان آنکھوں پر کسی انسان کو عاشق ہونے کی توفیق کیوں

نہ ہوئی؟ اور "جن صاحب" کو لاکھوں "نیم باز" آنکھوں کو چھوڑ کر ہماری آنکھوں میں ایسا کیا نظر آیا کہ وہ عاشق ہونے پر تلے بیٹھے ہیں؟ ہماری آنکھوں میں خوف کے سائے لہراتے گئے۔ ہم نے امکانات کا جائزہ لیا، اماں کہا کرتی تھیں "کھلے بال رکھ کر زیرِ سماں نہ جاؤ، آنکھوں کے پاس کالا ٹیکہ ہمیشہ لگا رہنے دو، ورنہ "جن" عاشق ہو جاتے ہیں۔ بھلا بیچن میں کون سمجھ سکا ہے ان رازوں کو، لیکن ہم جب کھلے بال زیرِ سماں جھاڑوں کے نیچے جھولا جھولتے تھے تب "جن صاحب" نے ہم کو کیوں پسند نہیں کیا؟ عاشق ہونے کی تیاری اس عمر میں ہو رہی ہے جب عشق کا دیوتا اپنے لطیف و سحر انگیز اثرات کو گھڑی میں باندھ کر زندگی سے کوچ کر جانے کے لئے تیار کھڑا ہے اور ہم سے اجازت طلب کر رہا ہے، اب اگر ہم اس عشق کے دیوتا کو خدا حافظ کہہ دیں تو پھر "جن" کے لئے جگہ خالی ہو جاتی ہے۔ ہم ان ہی خیالات میں گم ہند کی گولی کھا کر جب سو گئے تو نہ جانے کیوں پچھلے پہر رات کو خود بخود ہماری آنکھ کھل گئی، ہم نے اپنے برابر میں سوئے ہوئے مجازی خدا کو دیکھا معاً دل میں یہ خیال آیا کہ "جن" نے ہمیں ہمارے مجازی خدا کا بھیس تو نہیں بدل ڈالا؟ ہم نے باقاعدہ ہمارے سوئے ہوئے "مجازی خدا" کو گھورنا شروع کیا۔ ایسا بالکل پہلی بار کیا تھا۔ ہم نے ہمارے "مجازی خدا" کو صرف دیکھا تھا، زندگی بھر دیکھتے رہنے کی آرزو تھی کہ دیکھا تھا لیکن اس طرح شک کی آغوش سے ہم اُنہیں پہلی بار مسلسل گھورتے جا رہے تھے۔ بے پارے ہمارے مجازی خدا ساری شدائی سے بے خبر خوابوں میں گم تھے۔

اچانک گھڑیاں نے دو زوردار گھنٹے بجائے، یعنی رات کے دو بجے تھے۔ اماں کہا کرتی تھیں ”رات کے دو بجے بعض قرآنی آیات کا ورد کرنے سے ”جن“ حاضر ہو جاتا ہے۔ ہم نے سوچا کیوں نہ ہم ”جن“ کو حاضر کر کے تینہہ کریں کہ اس نے ایسا بے ہودہ فیصلہ ہمارے لئے کیوں کر رکھا ہے؟ کیوں ہماری آنکھوں کو بے نور کرنے پر تلا ہے؟ ہماری آنکھوں میں اُمیدوں، آرزوؤں اور حسین خوابوں کا نورانی سمندر ٹھاٹھیں مارتا رہتا ہے اور یہ ”ناری مخلوق“ بلاوجہ اس میں غوطہ لگا کر اس کو آلودہ کرنا چاہتی ہے لیکن پھر یہ خیال آیا کہ اگر ”جن“ حاضر ہو جائے اور ہمارا جواب دینے کے بجائے فوراً ہی عاشق ہو بیٹھے تو.....؟ صبح تک ہم ”جن“ کو آنکھوں میں بسائے ہوئے اپنے بھاری خدا کے آگے کتنے شرمندہ ہو جائیں گے؟ انھیں بجائے سکون و راحت اور خوشی دینے کے ”عقیب آتشیس“ پیش کرنے کے مرتکب ہو جائیں گے۔ بہر صورت ہم نے یہ ارادہ بھی ترک کر دیا۔ ہم اپنے آپ کو بھولتے جا رہے تھے۔ دل میں خوف سلطان ابراہیم تھا کہ نہ جانے کب خزانہ ہمارے دربار میں پیش کر دیا جائے اور ہم اپنی آنکھوں سے ہاتھ دھو بیٹھیں.....!

کسی طرح صبح ہوئی۔ بچے معمول کے مطابق اسکول و کالج جا چکے تھے۔ ہمارے ”بھاری خدا“ بھی نکل پڑے۔ ہم اپنے ڈرائیونگ ہال میں تنہا بیٹھ رہے اور آنے والے حالات پر غور کرتے رہے۔ خادمہ باورچی خانے میں اپنے کام میں مروف تھی۔ ہال میں لگی گھڑیاں نے بارہ بجائے۔ اچانک بہت زوردار قسم کی گڑگڑاہٹ سنائی دینے لگی۔ جیسے کوئی بڑی سی ریگ لڑھکائی جا رہی ہو.....

کال بیل کی آواز سنتے ہی ہم نے پھٹتے کی طرح اپنے کمرے کی طرف چھلانگ لگائی اور اپنی دانست میں خود کو محفوظ کر لیا۔

ہماری شخصیت، قد و قامت، وضع قطع کے اعتبار سے نمایاں اور وزن دار ہے۔ اس کے باوجود ہم "بید لڑاں" بنے ہوئے تھے۔ دل کی دھڑکن بے ترتیب ہو گئی تھی۔ ہم وحشت میں آیت الکرسی بھی بھول چکے تھے۔ ہمارا عاشق ہمارے در پر خزانے کی دیگ لئے کھڑا تھا اور ہم بجائے استقبال کرنے کے مرے جا رہے تھے۔ بھڑا کبھی طرح ہم اس جن کے ساتھ جانے کے لئے راضی نہ تھے جو خزانہ دے کر ہمیں لینے آیا تھا۔ ہم خوشی، خوشی ملک الموت کے ساتھ جانے کے لئے تیار تھے مگر اس نامراد عاشق کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔

پچانک ہمارے بند کمرے کے دروازے پر زور زور سے دستک ہونے لگی ساتھ ہی خادمہ کی آواز بھی سنائی دی: "بی بی! گیٹ اس سلنڈر والا آیا ہے۔۔۔۔۔" ہم نے سنگھار میز کے آئیے میں نہ صرف اپنا سر اپنا خود اعتمادی سے دیکھا بلکہ اُن آنکھوں کو بے ساختہ چوم لیا جو شدتِ خوف و غم سے بہنے لگی تھیں۔ نوڑکی پر برسات اتنی شدید تھی کہ ہمارے دل سے عاشقانہ مزاج رکھنے والے "جن" کا خیال بھی چھ گیا۔ ہم کو آیت الکرسی بھی یاد آچکی تھی۔ ہم نے حصار باندھ کر اپنے آپ کو بڑا پُر سکون محسوس کیا۔ ہم اپنے "جماڑی خدا" کے آگے شرمسار ہونے سے بچ گئے تھے اور عشق کے دیوتا کو پھر اصرار کر کے روک لیا تھا۔ تحریر ختم کرتے کرتے "حواسِ خمسہ" نے مجھ سے یہ سرگوشی کی جہ کہ "جن" اپنے عشق کا ڈھونگ بچا کر میری "چشمِ زنبیل" سے چھپے ہوئے محل و گہر چرانا چاہتا ہے تاکہ وہ اپنے خزانے میں اضافہ کر سکے، لیکن اب میں اپنی آنکھیں ہمیشہ کھلی رکھوں گی۔

”ہمیں بھی جشن کی سوجھی“

رات کو ہم اپنے بستر پر لیٹے لیٹے سوچنے لگے کہ سارے شہر میں یہ سدا آباد کا ”جشن چار سو سالہ“ منایا جا رہا ہے۔ سرکاری عمارتوں پر رنگ و روغن ہے بڑی سڑکوں کے فٹ پاتھ اس قدر صاف ہیں کہ وہاں اب راہرو بھی کم نظر آرہے ہیں۔ یہ ”الفاظ دیگر“ میدان صاف !

کھیں نصب کئے ہوئے مجھے چمکائے جا رہے ہیں تو کہیں رنگ برنگی جھنڈیاں لگ رہی ہیں اور بھی کئی طرح کی تیاریاں جاری ہیں۔ ہم نے لیٹے لیٹے ہی سوچا۔ کیوں نہ ہم بھی اس جشن میں شریک ہو جائیں بلکہ یہ جشن تو ہر فرد کو شخصی طور پر منانا چاہیے تو کیوں نہ یہ ابتداء ہم ہی کریں ۹

اور پھر ہوائیوں کہ ہم ”سوپر مین“ کی طرح اڑنے لگے اونچا بہت ہی اونچا ہم نے کئی خزاں رسیدہ درخت جو سڑگوں کے کنارے بید نما لگ رہے تھے ”اکھاڑ پھینکے۔ پھرے کی کئی کھنڈیاں پھرے کے ساتھ پھیل کر نیچ سڑک پر آ گئی تھیں۔ ہم نے انھیں ایک ٹھوکریں ”ٹھکانے“ لگا دیا پھر اس کے بعد ہم ان عمارتوں پر ہاتھ پھرا کر رنگ برسانے لگے جو مسیحا ہی مائل ہونے لگی تھیں، ہم نے ان بید نما بجلی کے کھمبوں کو بھی اکھاڑ پھینکا جہاں پر تاروں کے کچھ خوفناک انداز میں ملڑی کے جالوں کی طرح لٹک رہے تھے۔ کچھ ٹیلی فون کے

بجھے ہوئے کھبوں کی کمر سیدھی کی وہ بھی اس لئے کہ ہمیں بھی ٹیلیفون سے "رابطہ خاص" ہے اور دورانِ جشن بہت کام آنے والی چیز ہے ٹائپل فون؟ اور پھر ہم نے تالاب کے کنارے نصب کردہ ان سیاہ عجموں کو دیکھا تو ہمارے دل سے ایک آہ نکل گئی ہم نے ان عجموں کے قدموں تلے پھیلے ہوئے سرسبز لان کو دیکھا جہاں کچھ معصوم بچے بغیر کسی اہتمام کے جشن منا رہے تھے۔ ہم نے اڑتے ہوئے علامہ اقبال کی یادگار کے طور پر قائم کئے گئے اس شاہین کے مجسمے کو اشارہ کیا تو وہ بھی ہمارے ساتھ ساتھ اڑنے لگا۔

اب ہم بہت قدیم تاریخی حصے میں آگئے جہاں پر ایک دو نہیں یورپ سے چار چار مینار ہمیں حسرت سے دیکھ رہے تھے کہ ہم انھیں کچھ سنواریں اور ہم نے ایسا ہی کیا۔ ہر ایک مینار کو یوں رنگ دیا کہ سب ایک دوسرے سے الگ نظر آنے لگے یعنی ایک مینار 'سُرخ' ایک مینار 'سبز' ایک مینار 'زر' اور ایک مینار 'نیلا'! "چار مینار" اپنی یکسانیت کی تفریق پر رونے لگا، ہم نے ان چاروں میناروں کو رخصت ہوتی ہوئی دلہن کی طرح دلاسا دیا۔ نئی تہذیب کے نشیب و فراز سمجھا کر ہم نے پھر اُڑان بھری اور جاپڑے صحنِ مسجد میں جہاں کئی کبوتر ڈھیروں دانے کے درمیان جشن منا رہے تھے۔ ہم نے ادا سے بے نیازی سے دوبارہ اُڑان بھری اور چلے قطب شاہی گنبدوں کی طرف وہاں پہنچ کر ہم سوچنے لگے کہ جشن یہاں سے شروع ہونا چاہیئے یا جشن کا یہاں اختتام ہونا چاہیئے؟

ہماری سمجھ میں نہ آیا تو ہم چل قدمی کرنے لگے اور چلتے چلتے قلعہ گو لکنڈہ کے پاس آگئے۔ یہاں کے سنائے میں عبدالرزاق لاری کی ہمیں اچانک چیخ سنائی دی

اور ساتھ ہی توپوں کی گھن گرج بھی ہم کو اپنی کرتب بازیوں پر ہزار نماز سہی
 لیکن ہم میں امن پسند، ہم چیخ و پکار اور ہتھیار کی آوازوں سے بہت دور
 بھاگنے کے لئے ہی تو جشن منانے چلے تھے کہ ذرا دل بہل جائے گا۔ کچھ دیر
 ہمارا شہر بھی خوش ہو جائے کہ غیر اہم سمجھا جانے کے باوجود اس کے نام سے
 جشن تو منایا جا رہا ہے۔ نہ جانے ہم کون سے محل کے کھنڈروں تک پہنچ گئے
 احساس نہ ہو سکا ہمیں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز کے ساتھ گھنگرو کی چھن چھن
 بھی سنائی دینے لگی۔ شاید بھاگ متی کے پازیب نے سرگوشی کی تھی۔ شاید
 قلی قطب شاہ کے گھوڑے کی ٹاپیں ہم سے ملنے کے لئے قریب آرہی تھیں۔

ہم نے اس بار کافی لمبی اڑان بھری اور ہم شہر کے پھر قدیم و
 گنجان علاقے میں اتر پڑے۔ شاہین ہمارے ساتھ ساتھ اڑتے ہوئے نہ
 جانے کہاں رہ گیا تھا۔ ہم مختلف دشواریوں میں گھرے کھڑے تھے۔ ٹریفک کا
 نظام درہم برہم تھا، بندھی ٹھیلے، رکشے، سیکل، بس اور موٹر بس، آؤرکشہ
 اسکوٹر اور پیدل راہی سب ایک دوسرے کے ساتھ مل کر گویا جشن منا رہے
 تھے۔ کوئی جشن کے آداب سے واقف نہ تھا مگر جشن جاری تھا۔

اچانک، ہم لڑکھڑاکے ایک پتھر سے ٹھوکر کھا گئے، تب ہم نے
 دیکھا کہ وہ پتھر بڑی شان سے ہمیں مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ ہم نے بوچھا
 یہ آپ ہمارے راستے میں کیوں پڑے ہیں یہ۔ تو پتھر نے کہا۔ میں
 قطب شاہی دور کا پتھر ہوں، لوگ مجھے جشن کے موقع پر بھول گئے
 میں، میں انھیں اپنی یاد اسی طرح دلا دیتا ہوں کہ وہ دوبارہ مجھے بھول

نہ پائیں، میں کسی عمارت میں نصب نہ ہو سکا تو کیا، ہوں تو اُسی قطب شاہی دور کا جب اس شہر کی "ولادتِ باسعادت" ہوئی تھی، اور "حمید آباد" اس کا نام رکھا گیا تھا۔

میں چار سو سالہ قدیم تاریخ کا وہ زبر ہوں جو تاریخ کی "ت" پہ لگتا ہوں اور جشن کی "ج" پر اور شہر کی "ش" پر اور حمید آباد کی "ح" پر ان تمام شہریوں کے سر کے "کس" پر، جسے لوگ صدیوں سے اُٹھائے پھیر رہے ہیں..... —

اچانک ہم نے محسوس کیا کہ ہمارا سر جھک گیا ہے اور ہم اُڑنے کے قابل نہیں رہے اور یہ سب اس لئے ہوا کہ جشن کے خواب سے ہم بیدار ہو چکے تھے....

”بکرا اتر گیا“

ہم قطعاً تو ہم پرست نہیں بلکہ ہم اس قدر حقیقت پسند ہیں کہ سب لوگ ہماری ”حقیقت“ کو ہی سمجھتے ہیں، ہمیں نہیں۔۔۔۔۔ !
 ویسے ہم ”ناری مخلوق“ کے بارے میں اتنا جانتے ہیں کہ اس ”ناری مخلوق“ کو اللہ نے تاقیامت فتنہ انگیزی کی اجازت دے رکھی ہے اور دنیا والوں نے اس کا نام ”یلا“ رکھا ہے۔

ہاں ! ”تو ہم کہہ رہے تھے کہ ہم نے اپنی چھٹی و لاڈلی بیٹی کی جان کے صدقے اُتارتے رہنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ ہم نے اپنے نام کی طرح ”صدقہ“ یاد رکھتے ہیں۔ عمر رسیدہ بہت ہی قدامت پسند گھرانے کی خواتین تو ہمارے یہاں آتی رہتی ہیں اُن کے مشوروں پر عمل کرتے ہوئے ہم نے کئی بار اپنی بیٹی کی نظر بھی اُتاری جس میں چند سفید دھبوں کو پیلا رنگ لگا کر سر سے پاؤں تک سات مرتبہ اُتار کر جلا دیا جاتا کبھی کیسلے، اندھے جیسی دایسات چیزیں بھی رات کو سر ہانے رکھ کر صبح صدمتے میں دے دیا کرتے۔

اس کے بعد کچھ مشوروں کی فوج ہم پر غالب آنے لگی وہ یہ کہ ”جان کا صدقہ جان ہے“ ہم نے اپنی جان دینے کی ٹھانی اور تفصیل دریافت کی تو جواب ملا ”توبہ، توبہ یہ تو گناہ ہوا، جان کا صدقہ پرندوں، بچھوپایوں وغیرہ سے دیا

صدقہ اُتر وادیا۔ اڈا تو ہم بلا ناغہ شام کو خود ہی اُتار کر پھینکتے ہیں۔ لیکن ہمارے تمام ”اُتارے“ ہمارے داماد کی نظر میں بے کار رہے۔ وہ اپنے فریادانہ جفایات سے بھرپور محبت کی تکمیل کے لئے بکرے کا اُتارا، اُتارنے پرشل گئے، ہم نے سمجھایا کہ بکرا ہاتھ لگا کر دیتے ہیں، اُتارتے نہیں، مگر محبت کا مارا، عقل سے بھی مارا جاتا ہے نا؟ اس لئے ہمارے قابلِ داماد کئی کیلو وزنی ”بھینس نما بکرا“ خرید کر لے آئے جو مسلسل پیچھاڑیں کھا رہا تھا اور قابو میں آنے کا نام نہ لیتا تھا لیکن ”جوشِ محبت“ کے آگے بکرا تو کیا، شیر اور ہاتھی بھی کوئی چیز نہیں۔ ہمارے داماد نے اچانک ٹارزن کی طرح بکرے کو دیوچ لیا اور دونوں ہاتھوں سے اوپر اُٹھا کر ہماری بیٹی کے سر پر سے سات بار نمودہی وار دیا اور پھر بکرے کے گلے میں رستی باندھ کر پرانے ملازم کے حوالے کر دی۔ ہماری نازک اندام بیٹی پیسے میں نہا چکی تھی۔ گھبراہٹ کے مارے بُرا حال تھا۔ خیر! یہ سب ہنگامہ آرائی ہم دم سادھے دیکھتے رہے۔ دوسرے دن ملازم نے کہا، ”بی بی! آپ کی بیٹی کی بلا اُتر گئی، صبح تک بکرا اُتر گیا تھا۔“ ہم سمجھے نہیں تو کہا، ”بلا بکرا اُتارنے سے اُتری یا نہیں یہ معلوم ہو جاتا ہے صدقہ کا جانور“ وارنے کے بعد بہت ہلکا ہو جائے تو سمجھنا چاہیے کہ صدقہ اُتر گیا، تب ہمارے سمجھ میں بات آئی۔۔۔۔۔ کہ۔۔۔۔۔ بکرا اُتر گیا۔۔۔۔۔!۔۔۔۔۔!

”ہم نے بھی لڈو بانٹے“

ہم ہزار جہاندیدہ سہی لیکن بعض معاملات میں بالکل ہی نا تجربہ کاری ہیں، ہمیں یہ بات قطعی نہیں معلوم کہ بچوں کی پیدائش کے بعد جب ان کا نام رکھا جاتا ہے تو لڈو کس طرح تقسیم کئے جاتے ہیں۔

خیر! ہماری بیٹی، داماد کو اپنی نومولود بیٹی کے نام کا ”اعلانِ عام“ کرنے کا شوق ہوا، تو ہم نے کچھ چھوٹی کشتیاں، پھول جو چاندی کے بنے تھے اور اسی طرح کچھ چیزیں ان کے سامنے رکھ دیں جو کبھی ہمیں لوگوں نے تحفہً بھیجے تھے۔ بیٹی داماد کو وہ سب چیزیں بدائی لگیں۔ انھوں نے نئے طریقے سے بچی کے نام کے کارڈ بچھوڑے۔ ہم نے اپنے بڑے ہونے کا ثبوت پیش کرنے کے لئے لڈو کا انتظام

اپنے ذمہ لے لیا۔ ہم ایک جزل اسٹور پر گئے۔ دوکان دار سے کہا کہ ”لڈو تقسیم کرنا ہے“ ہمیں لڈو چاہیئے۔ جی بہت اچھا! کہہ کر دوکان دار نے ایک بڑا سا بند تھیلا ہمارے حوالے کیا اور ہم اپنی بزرگی پر غر کر تے ہوئے گھر لے آئے۔ تھیلا کھولا، لڈو نکالے.....

پچاکلیٹ کے رنگ کے لڈو پر موتی جیسی سفید لگی تھی۔ ہم نے تھالی میں لڈو اور نام کا کارڈ رکھا اور اس چھوٹی سی تھالی پر زرین جالی کا کپڑا جسے گولٹا لگا تھا باندھ کر تقسیم کروا دیئے۔ جب گھر والوں کے لڈو کھانے کا وقت آیا تو لڈو شائد خفا ہو گئے تھے۔ اتنے سخت

کہ تو نہ نا محال ہو گیا، لڑو کیا تھے، اچھے خاصے "کرکٹ بال" تھے۔ خسیس ہاون دستے کی مدد سے ٹکڑے کرتے گئے اور شکلیں بنا بنا کر کھاتے گئے۔

ہمارا شمار بزرگوں میں ہو گیا تھا، ہم لڑو چبانے کی آواز کو اونچا نہیں ہونے دے رہے تھے۔ ایک بڑا سا ٹکڑا منہ میں رکھا اور چوشنے لگے، کئی گے ملک خقیق سی مٹھاس کا احساس بہا۔ جب پنج سے ڈر کا وقت آیا تو ہم نے وہ ٹکڑا منہ سے نکال پھینکا !

خیر! دوسرے دن ہمارے دروازے پر کچھ دھماچو کڑی کے ساتھ ستم سی دستک سنائی دی۔ ہم نے دروازہ کھولا ایک صاحب اپنا پوکر اور لڑو ہاتھ میں پہلے ہم پر اپنا غصہ نکالنے لگیں۔ دوسری طرف وہ تو ایک صاحب (جو ہمارے عزیز بھی تھے) جن کے منہ سے خون ٹپک رہا تھا۔ ایک ہاتھ میں لڑو اور دوسرے میں دو دانت لئے کھڑے تھے۔ تیسری طرف ہم نے دیکھنے کی ہمت نہیں کی اور دروازے پر لگی "ان۔ آؤٹ کی پلیٹ کو دیکھا پھر "آؤٹ" "ان۔ آؤٹ" کرتے ہوئے ہم نے کینگرو کے بچے کی طرح گردن دروازے کے اندر کر لی اور دروازہ اتنی دیر سے بند کیا کہ ہمارے منہ سے دوسرا لڑو کا ٹکڑا ایک "کھٹک" کے ساتھ ٹوٹ گیا۔ ہم نے ہمارے غصے کے لڑو ٹھوکا لیکن لڑو کے ساتھ دانت بچا رہے تھے۔ اگلیا، اس طرح ہماری بزرگی بھی مستند ہوئی۔

ان لوگوں نے لڑو کھا مے ان سب کا حال ہم بتانے سے قاصر ہیں لیکن یہ ہے کہ ان لڑوؤں کی تقسیم سے بعد بہت سے لوگوں نے ہم سے ملنا پھوڑ دیا ہے شاید اس قدر سے کہ ہم نے اگر وہ لڑو کی تقسیم شروع کر دی تو کیا ہو گا ؟ =



”سیاست“

معزز قارئین! آپ سمجھ رہے ہوں گے کہ ہم موجودہ سیاست کے میدان میں، ہجوم بیگراں کے سمندر میں کسی طرح گھس پٹ کر ”الیکشن“ کے پھانسی نما تختے پر کھڑے ہونا چاہتے ہیں۔ جی نہیں، ہرگز نہیں! کبھی نہیں! اللہ نہ کرے کہ کبھی ہم سے ایسی بھیانک غلطی ہو، ہم ”بدی امور“ بھی اپنے گھر میں انجام دیتے دیتے تھک چکے ہیں۔ ہم فطرتاً ہی نہیں واقعتاً معمولی سے امن پسند شہری ثابت ہوئے ہیں۔

ہاں! تو ہم نے ”سیاست“ کے بارے میں جو لکھا ہے وہ دراصل ملک کی سیاست نہیں بلکہ ”اخبارِ سیاست“ کے بارے میں ہے۔ جی ہاں! روزنامہ ”سیاست“ کے بارے میں جن کے ایڈیٹر محترم عابد علی خاں صاحب اور جوائنٹ ایڈیٹر محترم محبوب حسین جگر صاحب ہیں۔ عالمی شہرت یافتہ سیاست اخبار ”کے بیہ بانی صاحبین کے بارے میں ساری دنیا جانتی ہے۔ مجھ ناچیز کو ان بزرگانِ علم و ادب کے بارے میں کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ہاں! تو بات ہے سیاست اخبار کی۔ صبح کے وقت ہمارے بند دروازے کی دراز میں سے یکے بعد دیگرے کئی اخبارات، اخبار والا سرکا جاتا ہے اور ہم اُس اخبار کے گٹھے پر جھپٹ پڑتے ہیں، جن میں کئی انگریزی اور اردو اخبار ہوتے ہیں اور جن کو ہم ”سیاست“

لے لیتے ہیں اور بڑے ٹھاٹ سے بیٹھ کر سرسری نظریں دوڑاتے ہیں۔ ہم ہمیشہ ”سیاست“ اُلٹ کر دیکھتے ہیں، یعنی آخری صفحہ سے ابتداء کرتے ہیں اور پہلے پر انتہا، نہ جانے کیوں ہمیں ایسی عادت ہے۔ اکثر ہم بے چین مگر نئے والی خبروں پر نظر پڑتے ہی بے خیالی میں اُٹھ کر ٹھلنے لگ جاتے ہیں اور ٹھلے ٹھلے ہی اخبار کا مطالعہ کرتے جاتے ہیں۔ ہم بڑھنے اور ٹھلنے میں اتنے منہمک ہو جاتے ہیں کہ ہمیں ”سیاست“ سے آگے کچھ نظر ہی نہیں آتا، نتیجتاً ہاتھ میں چائے کا کپ لے کر ہماری طرف آتی ہوئی خادمہ سے ٹکرا جاتے ہیں۔ چائے کا کپ اُلٹ جاتا ہے، ہم اپنے ”سیاست“ کو صاف پچا لیتے ہیں اور گرم چائے کی زد میں خود کو کر لیتے ہیں۔ گرم چائے سے جھلنے کے باوجود ہم ”سیاست“ کی طرف ہی متوجہ نہ کر دل ٹھنڈا کرتے رہتے ہیں۔ کہیں کہیں ”اختلاجِ قلب“ میں مبتلا کرنے والی خبروں سے بیزار ہو کر ہم ”فکرو خیال“ کا شعر پڑھ لیتے ہیں کیونکہ ہم کو یہ ایک شعر بھی بیگ دیوان کی طرح لگتا ہے۔ سازگار و ناسازگار حالات سے مطابقت رکھتے ہوئے جو شعروں کا انتخاب ہوتا ہے وہ ہمیں بے حد پسند ہے اور ہم اُس شعر کو یوں یاد کر لیتے ہیں جیسے کہ وہ شعر ہمارا ہی ہو۔۔۔۔۔ ہم مطالعہ اور چہل قدمی جاری رکھتے ہوئے اسکول و کالج جانے کیلئے تیار ہونے والے اپنے بچوں سے بھی ٹکراتے رہتے ہیں جو اپنی تیاریوں میں مصروف ادھر سے ادھر آتے جاتے رہتے ہیں، ہم سے ٹکراؤ کے بعد ہمارے بچے ہم کو زبردستی صوفے پر بٹھا دیتے ہیں۔ اب ہمارے بازو خادمہ دوسری چائے کی پیالی لاکر رکھ دیتی ہے اور اصرار کرتی ہے کہ پہلے ہم چائے پی لیں۔ ہمیں یہ ”مداخلتِ سجا“

بہتے ہوئے خوش اخلاقی سے کہنا پڑتا ہے کہ "شیشہ و قیشہ" کے بعد خادمہ
 پوچھتی ہے، کیا؟ کون سا شیشہ؟ اور نہ جانے کیا سوال ہوتا ہے کہ ہم سر
 ہلا دیتے ہیں۔ ایک بار اسی طرح خادمہ نے ہم کو شیشہ یعنی "ٹماٹو ساس کا شیشہ"
 صبح صبح ہمارے ہاتھ میں تھا دیا۔ ہم حیران ہوئے تو اُمیں نے کہا "آپ ہی نے تو
 کہا تھا شیشہ لانے کو؟" ہم جھجھلا کر ڈانٹنے لگتے ہیں، نہ جانے کیا کہتے ہیں کہ
 دوسرا گھی کا شیشہ ہمارے سامنے رکھ دیا جاتا ہے اور ساتھ شہد کا بھی، اور پھر
 "سرکہ" کا بھی۔۔۔۔۔ اللہ! اب ہم کیا کریں۔۔۔۔۔؟ ہم جب خادمہ کو ڈانٹتے
 لگے تو اس نے قسم کھانے کہا کہ ہم نے ہی اسے شیشے لانے کو کہا تھا۔ ہمیں خیال
 ہی نہیں کہ ہم نے کیا کہا تھا، شاید "شیشہ و قیشہ" دیکھتے دیکھتے منہ سے کچھ
 نکل گیا ہو اور نتیجتاً ہم اپنے اطراف شیشوں میں سجے بیٹھے رہ گئے۔

"سیاست" میں جب کبھی ہم انڈوں کے دام کم دیکھتے ہیں تو فوراً لازمہ
 کو دوڑا کھراٹاک کروا لیتے ہیں کیونکہ انڈے ہمارے کئی مسائل حل کرتے ہیں،
 ٹماٹوں کے کٹ میں، تو کبھی کٹلٹ پر، کبھی پلاٹو میں، تو کبھی سینڈوچ کے لئے
 کہیں لوز کی شکل میں تو کبھی پڈنگ کی ڈش میں، کبھی کیک کے ساپنجوں میں، تو
 کبھی فرائی ہین میں، کبھی سملیٹ تو کبھی اُبے ہوئے، ہمارے یہاں انڈوں کا
 بہت تحریک ہے۔ بچوں نے بینڈ ورک میں بھی انڈوں کے چھلکوں کی سخت ضرورت پیش
 آتی ہے مگر اس لئے خاص آغاز سے انڈے توڑنا پڑتا ہے خیر! تو ہم "سیاست
 کی مدد سے کچھ پکا لیتے ہیں۔ ہم عام طور پر ٹماٹو ہی نہیں دیکھتے ہاں! ٹماٹو کا یہ
 یہو گرم ضرور دیکھتے ہیں جو "سیاست" میں لکھا ہوتا ہے۔ اگر مطلب ہو، تو

بھی کھارٹی۔ وی کے آگے بیٹھ گئے ورنہ نہیں۔ ”سیاست“ سے ہی ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آج دن کیا ہے ؟ تاریخ کیا ہے ؟ ورنہ ہمیں تو ”معلومات“ نے اس قدر معروف رکھا ہے کہ ہم کو کچھ خبر نہیں ہوتی کہ کب شام ہوتی اہ کب صبح ہوتی۔ ارے نہیں، یہ تو ہم ذرا روائی میں بول گئے، صبح کب ہوتی ہے ہمیں اچھی طرح خبر ہوتی ہے، صبح تب ہوتی ہے جب ”سیاست اخبار“ آتا ہے۔۔۔۔۔ ہم نے سچ کہا نا۔۔۔۔۔

ایک بات بتانا ہم بھول گئے وہ یہ کہ اتوار کے دن لوگ دیر سے اٹھتے ہیں لیکن ہم اتوار کے دن بہت سویرے اٹھ جاتے ہیں۔ اتوار کا ”سیاست“ ہمیں ”جانِ عزیز“ سے کم نہیں لگتا، ہے نا ؟ آپ سمجھ رہے ہوں گے کہ ہم نے ”ہے نا“ پر اپنا مضمون ختم کر دیا، جی نہیں ایسی خوش فہمی میں نہ رہئے۔ کچھ چند قدم اور آپ کو ہمارے اس تحریری سفر میں ساتھ چلنا ہے، کچھ عرصہ سے ہمارے مضامین ”سیاست“ میں شائع ہونے لگے ہیں۔ یہ ”بزرگانِ علم و ادب“ کی مہربانی ہے۔ ہمیں بھی دوسروں کے سر درد کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنی کچھ سنانے کا موقع مل جاتا ہے اور اس طرح ہم بھی ”اہلِ سیاست“ ہو گئے ہیں۔ ”سیاست“ میں ہمارے لئے سب سے زیادہ اہم بات نظر آتی ہے وہ ”خواتین کا کالم“ ہے۔ خواتین یوں بھی بڑی باصلاحیت ہوتی ہیں۔ اس لئے تو علامہ اقبال نے کہا ہے کہ سہ وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ۔

بہ کسی کو کائنات میں رنگ نظر آئے نہ آئے لیکن ”سیاست اخبار“ نے اس

شعر سے تعاون کرتے ہوئے باقاعدہ ایک کالم خواتین کے لئے محفوظ کر دیا ہے اور لکھنے والی سبھی خواتین کی معیاری تحریروں سے ہم بھی مسلسل متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ ویسے ہماری بھی بہت حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ اب یہی دیکھئے نا کہ ہماری بے ربط سی تحریریں بھی سیاست کی زینت بنائی جاتی ہیں، ہم نے تو سیاست کے مطالعہ کے بعد ہی لکھنے کی مشق شروع کر دی تھی اور سیاست میں اپنی کسی تحریر کو پھپا ہوا دیکھنے کی خواہش گویا ہماری "آخری خواہش" تھی۔ آخر "اخبار سیاست" کی مالک و مہربان، سستیوں نے بڑے خلوص کے ساتھ ہماری خواہش کا احترام کرتے ہوئے ہماری تخلیقات کو شامل اشاعت کر ہی لیا۔ اس خلوص و تعاون کے ہم ہمیشہ ہی شکر گزار رہیں گے۔ ہم جب اپنا کوئی مضمون یا غزل سیاست میں دیکھتے ہیں تو ہماری خوشی بے ٹھکانہ ہو جاتی ہے اور اُس دن کے اخبار کو خاص طور پر ہم اپنے کباڑ خانے جیسی الماری میں "نوادرات" کی طرح محفوظ کر لیتے ہیں۔ ہم اُسے "سیاست اخبار" نہیں بلکہ "اہل سیاست" کی جانب سے دیا گیا، اعزاز سمجھتے ہیں اور یہی حقیقت بھی تو ہے ۔۔۔۔۔ ہے نا — !!!

دور ترقی اور ہم

ترقی کا تریاق بے اثر ہو کر احساس و فکر کا زہر ہم میں سرایت کر چکا ہے۔ بات یہ ہے کہ ہم جس کو ترقی سمجھ رہے ہیں اُس سے ہمارے عرصہ صحت میں کمی ہوتی جا رہی ہے۔۔۔۔۔ ! انسان کے آرام کے لئے فردت سے زیادہ ایجادات ہو چکی ہیں۔ اس مشینی دور میں انسان بھی مشین بن گیا ہے۔ ہم ترقی کی جست گھریلو مثالیں پیش کرنے جارہے ہیں، جس سے یقیناً آپ بھی متفق ہوں گے۔ دیکھئے۔۔۔ ! ٹیلی فون ایجاد ہوا۔ یہ ترقی ہی تو ہے تاہم آدمی جب چاہے، جس سے چاہے، جتنی دیر چاہے باتیں کر سکتا ہے۔ خط آدمی ملاقات کی بجائے پھاڑتا تھا مگر اب ٹیلی فون تین سھتے ملاقات کا سبب ہے۔ بہت سے کام ٹیلی فون سے بنتے اور بگڑتے آرہے ہیں۔ زندگی میں ٹی۔وی بھی فروری ہے۔ دل بہلائی کا سامان گھر پر ہی ہو جاتا ہے، خبریں سُنی جاتی ہیں، ملک کے اندر اور باہر کی فضا جانی جاتی ہے، مطلب یہ کہ ترقی کا دوسرا ثبوت۔۔۔۔۔ تیسرا ثبوت ہے ریفریجریٹر، اس میں سب کچھ اسٹور رہتا ہے، گوشت، ترکاری، دوائیں، پھل، ٹھنڈا پانی، برف، ہفتہ میں ایک دن بچوان اور پھر بیٹھ کر کھانا ہی ہوتا ہے نا! اسٹارٹی وی نے تو معروضیات میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ ہر وقت تازہ پکا ہوا کھانے کے بجائے لوگ باسی کھانے کے عادی ہو گئے ہیں۔

جو تھی ترقی ہے ایرکنڈیشنڈ یا ایرکولر موسم گرما کو ندامت کے سوا دھڑکا دیا گیا ہے ؟ سر پہل کر آگ بگولہ ہو کر چلا جاتا ہے ۔ ہم گھر کے ماحول کو ٹھنڈا کر کے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں ۔ 'استری' ، بجلی کے پنکھے ، سالے پیسے کی مشین ، ٹرانسٹرنز وغیرہ تو پرانے زمانے کی باتیں ہیں ، کپڑے دھونے کی مشین نے "خاتون خانہ" کو وہ آرام دیا ہے کہ آج تک کسی خادمہ نے نہیں دیا ۔ دھوین یا دھوبی کے بغیر کپڑے دھل جاتے ہیں ۔

آج کل کمپیوٹر کی حکمرانی ہے ۔ حسابات میں غلطیاں عام ہیں ۔ انسان جو کمپیوٹر کا موجد ہے وہ کبھی کیسج بولتے ہوئے قائم نہیں رہ سکا ، تو بھلا انسان کی "موجد" کیسے ہمیشہ سچ کہہ سکے گی ۔ کمپیوٹر سے کئی پریشانیوں کا سامنا ہے ۔ مثلاً ایرلائسنس کے آفس میں نام کی غلطی ، بینک اکاؤنٹ میں حساب کی غلطی ، ایئر لائن میں غلطی ، بلڈ گروپ بھی غلطی کا شکار ، اس لئے ڈاکٹر بھی غلطی کا شکار ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !

ایک ہیمنہ آرام اور ٹھٹھا سے گزار کر ہم کو احساس ہوتا ہے کہ واقعی زندگی بڑی پر لطف ہے لیکن جب بجلی کا بل ، ٹیلیفون کا بل ، اسٹارٹی وی کا بل ہاتھ میں آتا ہے تو آہ بھی نہیں نکلتی ، سمجھ میں آتا ہی نہیں کہ آخر اتنا بل کیسے آیا ؟ فرد کوئی گڑ بڑ ہے ، ہزاروں کا بل ادا کر کے ہم بیمار ہو جاتے ہیں فکر لمحو لمحہ احساس دلاتی ہے کہ پورا ہیمنہ پڑا ہے ، باقی اخراجات کیسے پورے ہوں گے ؟

ترقی تو صرف سامانوں کی حد تک ہوئی ہے ، ترقی نے کبھی کوئی مشین

نہیں بنائی جو دولت کی بارش کر سکے۔ فرض کیجئے دولت کی بارش ہو بھی جائے تو یقیناً بلوں میں مزید اضافہ ہوگا۔ دولت کے "اسٹور روم" کا کرایہ یا "میر" تو ہو گا نا۔۔۔۔۔ 4

ہمیں اکثر یہ خیال آتا ہے کہوں نہ ہم اُس پرانے دور میں اُلٹے پاؤں لوٹ جائیں، جہاں گاڑی، پٹرول جیسی ہنگامی چیزوں کا تصور بھی نہیں تھا۔ ہاتھ کے رکشا کے بعد سیکل رکشا یا پھر دور تک پیدل چلنے میں بھی "شان" ہو کرتی تھی (پالکی کا دور ہم نے دیکھا نہیں)۔

بجلی کا بل مٹی سی قطار میں ٹھہر کر جب ہم گھر لوٹتے ہیں تو سارے بدن میں "ہلیریا" جیسی کیفیت محسوس ہونے لگتی ہے، ہم لیموں کا رس پی کر سو جاتے ہیں اور ملاٹل جاتی ہے۔ ٹیلیفون کے بل کی ادائیگی اتنی دیر میں ہوتی ہے کہ کئی بار ہم بیہوش ہو کر گر چکے ہیں اور اس پلاسٹک لوگوں نے ہمارے منہ پر پانی کے پھینٹے مار کر بھوش دلا یا ہے۔

ہزاروں روپے کا بل ٹیلی فون آفس میں بھر پکنے کے بعد ہم میں اتنی سکت باقی ہی نہیں رہتی کہ ہم کچھ ناشتہ کر لیں، ہم ٹیلیفون کے تاروں کی طرح اُلجھے اُلجھے گھر پہنچتے ہیں اور بستر پیروں دراز ہو جاتے ہیں جیسے کبھی نہ اٹھنے کی قسم کھا چکے ہوں۔ لیکن ٹیلی فون کی مددھر گھنٹی سن کر ہم لپک کر ریسورٹ اٹھا لیتے ہیں اور اپنے کسی جمنوا کے آگے ٹیلی فون بل کا رونا روتے روتے غیر ارادی طور پر ہنس پڑتے ہیں اور بڑی خوش اخلاقی سے اپنے "ہم کلام" سے کہتے ہیں۔

"خیر! کوئی بات نہیں آپ سے گفتگو ہو جاتی ہے، یہ بڑی بات ہے۔ بلوں کا

کیا ہے وہ تو آتے ہی رہتے ہیں۔۔۔۔۔ وغیرہ۔۔۔۔۔ وغیرہ۔۔۔۔۔ !
 بات ختم ہوتے ہی ہماری "خود کار انگلیاں" کسی درست کا نمبر ڈائل کر دیتی ہیں
 اور ہم پھر سے محو کلام ہو جاتے ہیں۔ آنے والے دنوں کے نئے بل کا خوف پھارے
 دل سے نکل جاتا ہے اور ہم نمبر پر نمبر ملاتے جاتے ہیں اور گھنٹوں باتیں کرتے
 جاتے ہیں۔ اس دور ترقی نے ہمیں خوب یوں سکھایا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ
 ہم لیسٹروں کی طرح گھنٹوں نہ صرف بول سکتے ہیں بلکہ یوں سکھایا بھی سکتے ہیں۔
 ہم بہت سارے مسائل سے دوچار رہتے ہیں۔ اس لئے اکثر ڈاکٹروں سے
 مستقل رابطہ رہتا ہے۔ ہم اپنے "پل پل" کی خبر اپنے فیملی ڈاکٹر کو دیتے
 اور مشورہ لیتے رہتے ہیں مثلاً جب ہم کہتے ہیں ڈاکٹر صاحب ! ہماری نبض
 ایک سنو فی منٹ چل رہی ہے تو ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ ضرور کوئی صدمہ ہوا ہوگا
 یا پھر آپ نے ٹیلی فون کا بل لیا کیا ہوگا، ہم اپنے فیملی ڈاکٹر کے مزید
 معتقد ہو جاتے ہیں۔

کبھی ہم بتاتے ہیں ڈاکٹر صاحب ! ہماری نبض ساٹھ چل رہی ہے تو
 ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں آرام کیجئے، ضرور آپ کچھ سوچ رہے ہونگے یا آنے والے بجلی
 کے بل کا خیال آ رہا ہوگا، اور ہم اپنے فیملی ڈاکٹر کی اس "الہامی صفت" کے اتنے
 قائل ہو جاتے ہیں کہ ہمیں اس دور ترقی "پر ذرا دیر کے لئے رشک آ ہی جاتا ہے۔
 احساسِ مسراہٹ کر جانے والے زہر کا اظہار ابھی تک ہم نے ڈاکٹر سے نہیں کیا
 وہ اس لئے کہ ترقی کا کوئی تجربہ ہم پر نہ ہو جائے۔۔۔۔۔ !

تجربات کی ترقی ہمیں بھی "ترقی کی منزل" تک وقت سے پہلے نہ پہنچا دے نا!



”ہم اور ہمارے وہ“

یہ جو ہمارے ”وہ“ ہیں نا! بڑے ”وہ“ ہیں۔ ان کو کب غصہ آجائے گا کب یہ سنجیدہ ہوں گے۔ یہ کب خوش ہوں گے اور کب ریخیدہ ہو جائیں گے اس کا اندازہ ہمیں آج تک نہ ہو سکا۔ ہم نے کئی بار ان کے مزاج کے بھنور میں غوطہ لگائے، کئی بار ڈوبتے ابھرتے رہے مگر ان کی ذات کی گہرائی تک ہم نہیں پہنچ سکے۔ یہ اکثر وقتی طور پر جذبات کی لہر سے گردشِ دوراں کی تہر تک پہنچ جاتے ہیں تو کبھی حوصلے کے ساحل پر منجمد ہو جاتے ہیں۔ ان کے ڈوبنے ابھرنے سے ہوتا تو کچھ نہیں لیکن ہم احساسِ کمتری کے آبشاروں میں بہہ نکلتے ہیں۔ ہمیں شرفِ حاصل ہے ان کے رفیقِ حیات ہونے کا، مگر ان کی حیات کا انداز دوڑنے والا سا ہے۔ ہم اپنی شکستہ پائی کے باوجود ان کے ساتھ دوڑ لگاتے رہتے ہیں۔ ہمارے ”زخمِ پا“ کبھی مندمل نہیں ہو پاتے۔

”وہ“ مشرق کی جانب چلتے چلتے اچانک رخ بدل کر مغرب کی طرف دوڑنے لگتے ہیں۔ جیسے سر پہر کے بعد آفتاب جانبِ مغرب تیز گام ہو جاتا ہے، دیکھئے تو ذرا ان کی عادیں جو ہمارے لئے سوہانِ روح بن جاتی ہیں اور کبھی دودھ امدِ شہد کی نہروں والی جنت میں سکونت کا گمان ہوتے لگتا ہے۔ یہ عام آدمیوں کی طرح ہماری تعریف نہیں کرتے یہ ہمیں دنیا سے ہی نہیں خود اپنی بھجھ نظر سے پھپھا رکھنا چاہتے ہیں۔ ہمارا کوئی بھی پخوان ان کے پسند کے قابل نہیں ہوتا۔ جب کبھی ایسا اتفاق ہوتا تو ہم بھی کی طرف بڑھنا

امید سے دیکھتے ہیں کہ شاید پہلے "لقمہ لذیذ" پر آج تو داخل جائے گی مگر دوائے ناکامی! یہ ٹیپ چاپ پیٹ بھرنے کے بعد دستِ خولان سے اٹھ جاتے ہیں۔ مگر کبھی کسی "ڈش" میں مزہ زیادہ یا میٹھے میں شکر زیادہ ہو تو پہلے ان کی بھنویں چڑھ جاتی ہیں۔ بعد میں یوں اظہار ہوتا ہے۔ "ہمیشہ ایسا کھان تو نہیں ہوتا تھا" اب کیا بات ہو گئی ہے۔ لیجئے صاحب ہم نے چوبکڑا لیا۔ ہم پر ہونے والی تنقید میں ہماری تعریف ہم نے ڈھونڈ لی۔ "پہلے نہیں ہوتا تھا" یہ مطلب یہی ہوتا ہے کہ ہم اچھا کھان کرتے ہیں۔

مگر زبان سے اعتراف کرنے میں وہ ہمیشہ ہی پس و پیش کرتے رہے ہیں کہ کہیں ہمارا دماغ خراب نہ ہو جائے۔

"وہ" ہمارے لئے بہترین ساٹیاں لاتے ہیں۔ خوب سے خوب تر کا انتخاب ان کی نظر میں ہمیشہ نکلا رہتا ہے۔ ہمارے پیہننے کے بعد بے چارے اپنی لائی ہوئی ساڑیوں کے بارے میں تعریفوں کے پُل باندھنے میں لگ جاتے ہیں اور ہمارے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہتے۔ وہ نہیں چاہتے کہ ہم ان کی نظر کا شکار ہو جائیں اور دوشکم سے تڑپنے لگیں۔ بس ایک ہی ٹھہری نظر میں وہ ہمارے سراپے کا جائزہ لے کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ دوبارہ کی زحمت وہ کبھی نہیں گوارا کرتے ہاں! اگر ہم سے کوئی غلطی سرزد ہو تو اچھی طرح خبر لیتے ہیں۔ مثلاً اگر ہم بار بار ایک ہی ساڑی پہن کر کہیں جانے اور آنے لگیں تو کہتے ہیں۔ "کیا تمہارے پاس ایک ہی ساڑی ہے؟ کیا الماریاں ہراج کرنے کا ارادہ ہے....."

وغیرہ وغیرہ۔

وہ ہمارے لئے ساڑیوں کا انتخاب بہت ہی محبت سے کرتے ہیں۔ انتہائی خوش رنگ، بڑے ہی جان دار پرنٹ ہمارے لئے خرید لاتے ہیں۔

کبھی کبھی اگر ہم اپنی پسند سے کوئی بالکل سادہ ساڑی خرید لیں اور پہن کر کہیں جانے لگیں تو ارشاد ہوتا ہے کہ کیا یہ ساڑی تانی مالا کی ہے ؟ یا دادی مالا کی ساڑی تم نے تیرا گا پہن لی ہے ۔ ؟

ہم منہ پھلائے ہوئے کپڑے بدل جاتے ہیں اور دل میں سوچتے ہیں کہ ہم خود ہمارے نہیں رہے ۔۔۔۔۔

چلے ! اب ہم چلتے ہیں ، ہمارے وہ ہمارے ساتھ شاپنگ کے لئے تیار کھڑے ہیں اور ہم ان کی لائی ہوئی جھم جھماتی شوخ رنگ ساڑی پہن کر جا رہے ہیں ۔۔۔۔۔ !

”آج کل“

خدا معلوم آج کل ہمیں کیا ہو گیا ہے جو ہم ”اُلٹی گنگا“ بہانے پر تلے ہیں آج کل ہم اخبار اُلٹی طرف سے پڑھنے لگے ہیں یعنی کہ آخری صفحے سے شروع کر کے پہلے صفحے پر ختم کرتے ہیں۔ اگر ہمارے بس میں ہوتا تو ہم دنیا کا نقشہ بھی اُلٹ دیتے اور چاند تارے واقعی قدموں تلے ہوتے لیکن زمین دھنسنے ہوئے پہاڑ بھی ہم پر ٹوٹ پڑتے۔ فی الحال اس پروگرام کو ملتوی سمجھئے۔

ہم اپنے آپ میں یہ کچھ عرصہ سے ایسی تبدیلی محسوس کر رہے ہیں جو بیان سے باہر ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ خبریں ہماری نظروں سے نہیں گذرتیں بلکہ نظریں خبروں پر سے گذری جا رہی ہیں۔ نتیجتاً ہم غلط سلاط پر پڑھتے لگ گئے ہیں۔ مثلاً ”فلاں ولد فلاں کا انتقال“ ہم ولد کے بجائے ”اور“ پڑھ کر دل میں افسوس کرتے لگتے ہیں کہ ایک ہی گھر میں دو افراد وفات پا گئے اور بھرے دل سے دعائے مغفرت بھی کر دیتے ہیں۔ کہیں ”اکتوبر“ لکھا ہوا ہو تو ہمیں ”کیوٹر“ نظر آتا ہے۔ مثلاً کیوٹر میں برساتی میلہ ہم یہ سوچتے ہیں کہ شاید بڑا سا کیوٹر نما کوئی ہال بنا کر اس میں مصنوعی بارش سے میلہ لگایا جائے گا، اور لوگ بھیگ بھیگ کر بٹی بن جائیں گے۔۔۔۔۔ !

ہمیں اعتراف ہے کہ ہماری ان غلطیوں کا سبب ہماری عجالت پسندی ہے۔

وہ یوں ہے کہ ہمارے پاس روز صبح اُردو اور انگریزی اخبارات کا ایک ہنڈل آتا ہے

جیسے ہم سب سے پہلے پڑھنا چاہتے ہیں، اس سے پہلے کہ ہمارے لئے کسی دوست کا کوئی معلوماتی فون آجائے، ہم پہلے حیرت جانا چاہتے ہیں۔ کبھی کبھی ہم اپنے شناسا چہرے بھی اخبار میں دیکھ کر زبردستی ہنسیوں کو بھی دکھاتے ہیں۔

جلوسوں کی خبر تو ہمیں سب سے پہلے پڑھنا ہوتی ہے کیونکہ یہ خبر ہمارے لئے بہت اہم ہوتی ہے۔ ہمارے باہر جانے کا پروگرام جلوسوں پر ہی منحصر ہوتا ہے۔ جب جلوس نہ ہو تو ہم گھر سے باہر نکلنے کی جسارت کرتے ہیں ورنہ ہمیں تو ہمارا گھر ہی محفوظ لگتا ہے ہاں، تو ہم کچھ رہے تھے کہ ہم نے اپنا انداز مطالعہ بدل ڈالا ہے۔ کئی مضامین کے ”بقیہ سلسلے“ اور ابتدائی صفحات بعد میں پڑھتے ہیں۔

ہم اخبار پڑھنے کے عادی ہونے کے باوجود ”دن اور تاریخ“ نہیں جانتے کیونکہ ”دن اور تاریخ“ پڑھنے تک دوسری تاریخ آجاتی ہے اور دوسرا دن نکل آتا ہے۔ اب بھلا ایرانی باتوں کو کیا یاد کرتا۔ اخبارات سے ہماری دوستی پرانی ہے لیکن مطالعہ ہم نئے انداز میں کرنے لگے ہیں جس سے کافی مشکلات پیدا ہو گئی ہیں۔ ہمیں اکثر شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جب ہم غلط خبریں پڑھ کر گھر والوں کو سناتے ہیں اور بڑوں سے ”ڈانٹ“ اور چھوڑوں سے ”مات“ کھا جاتے ہیں۔ ہمارے سر تاج ہمیں سمجھاتے سمجھاتے تنگ آچکے ہیں، مگر اب تک ہم میں تبدیلی ذرا بھی نہیں ہو سکی۔

خدا کا شکر ہے کہ ابھی ہم سطروں کو اوپر سے نیچے دیکھ رہے ہیں۔ اگر سطریں نیچے سے اوپر دیکھنے لگیں، تو دنیا کا ترس ہی لیکن کھٹ کا نقشہ یقیناً بدل جائے گا۔

اس کے باوجود ہم ایک غلطی کبھی نہیں کرتے ، ہرگز نہیں کرتے
 وہ یہ کہ اعتبار کبھی کسی کو پہلے نہیں پڑھنے دیتے ، ہمارے بعد اُلٹا سیدھا
 ہم سے پہلے کچھ بھی نہیں ، ہرگز نہیں !
 مگر آپ لوگ ہماری نقل کرنے کی کوشش نہ کیجئے کہ اسی میں
 جعفرانیائے غلطیوں کا اندیشہ ہے ، ہے تا ؟



اخبار اور ہم

تکسلائی، ہم، دھماکہ، اغواء، کانفرنس، ڈاکہ، سرقر، اور۔۔۔
 ... اور بھی بہت کچھ

اس طرح کی خبریں ہم روزانہ اخبار میں دیکھتے دیکھتے جبکہ ہم سے زیادہ تنگ آگئے تو ہم نے اخبار کی سرخیاں بھی دیکھنی چھوڑ دیں، لیکن چونکہ ہم اخبار دیکھنے کے عادی ہیں اور یہ عادت ہمیں نہ صرف ورثے میں ملی ہے بلکہ ہمارے ”شوہر نامدار“ کے خاندان میں بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ اس لئے یہ عادت چھٹتی نہیں ہے ظالم کے مطابق ہماری سانسوں سے بندھ چکا ہے، ”محض عجیب ہم اپنی بالکنی سے باہر منہ کر کے صبح تازہ ہوا میں لمبی لمبی سانسیں لیتے ہیں اس وقت ہمیں اخبار کی یاد آجاتی ہے اور ہم اپنی سانسوں لینا بھول کر پوری طرح بلکہ علاً اس یاد کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور یہ کم بخت یاد دہانی نہیں آتی، اپنے ساتھ ایک اور یاد لے آتی ہے وہ ہے ”چائے کی یاد“ صبح کی اولین ساعتیں ہم حسبِ حقیقت عبادت کے بعد اخبار اور چائے سے شروع کرتے ہیں۔ اب چونکہ اخبار کی سرخیاں دیکھتے ہی احتجاج ہونے لگا ہے، اس لئے ہم نے اپنی نگاہیں سرخیوں سے پھیر لیں اور ہم دوسری طرح کی خبریں پڑھنے لگے ہیں۔ مثال کے طور پر ”انڈوں کا نرخ“ ”انڈوں کی قیمت فروخت“ ”پھر چلر قیمت فروخت فی لٹرا ۸۰ پیسے

وغیرہ وغیرہ۔ انڈے تو ہمیشہ ہمارے کام آتے ہیں، نہ صرف پیٹا کی آگ بجھاتے ہیں بلکہ کبھی کبھی سر میں بھی لگائے جاتے ہیں۔ غرض کہ کچن سے شروع ہوتے ہوئے کئی ناکام جلسوں میں اپنی کامیابیاں منواتے ہوئے کبھی کبھی بچوں کے امتحان کے صفحوں پر جم جاتے ہیں۔ دوسری خبر ہم یوں ملاحظہ فرماتے ہیں۔ "طلوع آفتاب اتنے بج کر اتنے منٹ اور غروب آفتاب اتنے بج کر اتنے منٹ" ہمیں یہ "نظام شمسی" دیکھ کر یہ شہریاں دہکتی ہیں جو ہم باقاعدہ ترم سے گنگنانے لگتے ہیں۔

دوبتے سورج کو وقتِ شام دیکھ
حُسن والے حُسن کا انجم دیکھ

..... اور پھر اپنی نظر کو آگے بڑھنے کا حکم دیتے ہیں۔ "زیادہ سے زیادہ درجہ حرارت اور کم سے کم درجہ حرارت" ہمارے احساس کو جگا دیتا ہے اور ہمارے منہ سے ایک آہ سی نکل جاتی ہے جو کبھی گرم ہوتی ہے تو کبھی ٹھنڈی، گویا ہم ہم نہ ہوئے موسم ہوئے اور پھر موسمی پیش قیاسی کے بھنور میں پھنس جاتے ہیں۔ حکم موسمیات کے بموجب دونوں شہروں کے "مطلع" کی اطلاع ہوتے ہی ہم چونک جاتے ہیں۔ "مطلع" وہ کیا بات ہے؟ پھر ہم بھی مطلع لکھنے بیٹھ جاتے ہیں، ابھی قلم ہاتھ میں لیا ہی تھا کہ آنکھیں پھر بھٹکنے لگتی ہیں۔ چلتے چلتے ان شخصی سطروں پر رک جاتی ہیں جہاں سطر فلاں کی فلاں مقام پر روانگی یا واپسی وغیرہ پھر شہر کے خصوصی ٹائمنوں سے ہماری نظر ٹکرا جاتی ہے فلاں کا جلسہ تہنیت، فلاں کی لکچوشی، فلاں ہال میں یا فلاں کلب میں وغیرہ وغیرہ بہت سارے وغیرہ

اب ہماری چائے ختم ہونے والی ہوتی ہے کہ ہم ڈاک والے کا لم پر توجہ کر لیتے ہیں اس میں تو کسی مسائل اور کئی حل لکھے ہوتے ہیں مثلاً اناج کی قیمتیں، ہومیوپیتھی و ایلوپیتھی علاج پر معلومات اور بلدیہ کی عدم شکایات اور بھی اس طرح کی بہت سی باتیں پھر ہماری نظریں "انتھل پڑھال" کی دردناک خبروں پر سے ہوتی ہوئی شادی اور ولیمہ جیسی پُر مسرت خبروں پر پڑ جاتی ہیں۔ ہم کچھ مسرور ہو جاتے ہیں کہ ابھی ہمارے شہر میں خوشیوں کا سلسلہ جاری ہے۔ حالات زیادہ پریشان کن اگر ہوتے تو بھلا شادی جیسی تقاریب کیسے منعقد ہو سکتیں، کچھ دیر کے لئے ہمارے دل کو قرار آ جاتا ہے، پھر ہم معروفیات کے اس صفحے پر پہنچتے ہیں جس میں کئی مذہبی جلسوں کی اطلاع ہوتی ہے۔ ہم اور بھی مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اللہ والے لوگ ابھی دنیا میں بہت ہیں، فی الحال "گہرانے والی" کوئی بات نہیں۔ پھر ہم "ضرورتِ رشتہ" کے اشتہارات میں الجھ جاتے ہیں۔ کئی معقول و نامعقول رشتوں کے اعلانات پڑھ کر غور کرتے ہیں کہ کس کا رشتہ کس سے ہونا چاہیئے۔ جب بات سمجھ میں نہیں آتی تو ہم دوسری ضرورتوں یعنی "کاریگر کی ضرورت ہے" "خادم کی ضرورت ہے" جیسے جملوں پر دھیان دیتے ہیں مگر وہاں بھی کچھ پلے نہیں پڑتا تو ہم "ہماری ضرورت" پر آ جاتے ہیں سوچتے ہیں کہ کس طرح "کچھ" بیچ کر مناسب قیمت طے کر کے کچھ خرید لیں۔ پھر ہم "کرایہ پر حاصل کیجئے" پر رکتے ہیں۔ ہمیں ایک کیف سا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے شہر میں بہت سے لوگ ہیں جنہیں مکان کی ضرورت ہے۔ نئی زندگی کی شروعات کرنی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ زندگی ابھی باقی ہے اور ہم خود بخود مسکراتے ہیں۔ اب

”تنگ آ کے آخر....!“

اور نہیں تو کیا، آدمی تنگ آ جائے تو کیا نہیں کرتا؟ کسی سے جھگڑا ہو تو مار پیٹ پر آجاتا ہے۔ کسی سے خفگی ہو جائے تو بات چیت کرنا بند کر دیتا ہے۔ کوئی بات ناگوار ہو تو مسکرانا چھوڑ دیتا ہے۔ دنیا سے سزاوار ہو جائے تو ”تارک الدنیا“ ہوتے سے بھی گریز نہیں کرتا ہے نا؟

مگر ہم تھے ایسا کچھ نہیں کیا، صرف ”مول تول“ کرنا چھوڑ دیا ہے وہ بھی تنگ آ کے..... قصہ یہ ہوا کہ ہمیں آٹے دال کا بھاء، خوبی قسمت سے ابھی ملک معلوم نہ ہو سکا تو ہم چلے بھابی ترکاری کا بھاء پوچھنے، صبح کی چھل قدمی کے دوران ایک بندھی پرسچی ہوئی دوکان کی طرح ترکاری دیکھتے ہی ہمارے منہ میں پانی بھر آیا۔ ہم چونکہ اس کے وزن سے واقف نہیں تھے، نہ کبھی سبزیاں خریدی تھیں، پتہ ہی نہیں تھا کہ یہ کس تول اور کس مول بکھتی ہیں.....

ہم نے بندھی والے سے پوچھا کہ دس گرام ٹماٹے کیسے ملیں گے؟ بندھی والا بڑا بیوقوف نکلا، حقارت سے ہنستے ہوئے کہنے لگا، یہ سونا یا چاندی نہیں ہے بالی جی! یہ گرام، درام سب نئے زمانے کی باتیں ہیں، میں تو پرانا آدمی ہوں اور ٹوکڑے کے حساب سے ترکاری بیچتا ہوں، زیادہ بھڑ زیادہ ٹوکڑا، اور جسے کم سیر، آپ نے بی بی جی گیدا ترکاری کبھی نہیں خریدی؟ ہمیں احساس

ہوا کہ ہم واقعی ابھی تک گھانس ہی کھاتے رہے ہیں۔ ہم نے اپنا شان دکھانے کے لئے ایک ٹماٹر کا ٹوکرا خرید لیا، وہ بھی ایک سو پچاس روپے میں، اب سودا تو ہو گیا۔ سوال تھا کہ ٹوکرا گھر تک کیسے لے جایا جائے۔ ہم جس جگہ چہل قدمی کے لئے گئے تھے وہاں کسی بھی سواری کا دور تک پتہ نہ تھا، بڑی والے نے ہم پر رحم کھاتے ہوئے ہمارے سر پر کسی طرح ٹوکرا رکھ دیا، کم بخت نے ہماری بیہوشی کی ساری کا بھی لحاظ نہ کیا، ہم جیسے جیسے آگے قدم بڑھاتے، ہر قدم پر ٹوکرا کا وزن زیادہ محسوس کرتے۔ پسینے سے ہم اس قدر بھیگ گئے تھے کہ ہمارے سر سے پسینے کی نہریں گردن تک بہہ کر گردن تک اترنے لگی تھیں، مگر ہم لال، لال ٹماٹر کے ٹوکرا کو ایک تاج کی طرح سر پر سجائے چلے جا رہے تھے۔ سامنے ایک گیٹ کے پاس ایک "سائیکل رکشہ" سے ایک برقعہ پوش خاتون بڑا سا توشہ دان لے کر اتریں، رکشہ خالی ہوا۔ اُس نے ہمیں بغور دیکھتے ہوئے پوچھا، کہاں جانا ہے؟ ہم ہانپ رہے تھے، لڑکھڑائی آواز میں کہا، ادھر، اشارہ ہم نے آنکھوں سے کیا تھا کیونکہ ہاتھ تو ٹوکرا کو جکڑے ہوئے تھے نا!

رکشا والا مسکراتے ہوئے بولا، پچھ روپے ہوں گے اور ٹوکرا کے الگ۔۔۔۔۔ ہم نے کہا ٹوکرا کے پیسے تو ہم بڑی والے کو دے آئے ہیں، اُس نے کہا تو کیا ہوا؟ رکشہ والے کو بھی دینے پڑتے ہیں۔ اس نئے قانون سے ہم بالکل واقف نہ تھے۔ خیر! بات دس روپے میں طے ہو گئی۔ کم بخت رکشا والے نے ہمارے سر سے بے دردی کے ساتھ ٹوکرا گھسیٹ کر رکشا کی کشتی میں رکھ دیا اور ہم اپنے

سُہ کو سہلانے لگے اور ٹوکے کو دیکھنے لگے جو ہمارے سر کے کئی بال توڑتے ہوئے ہم سے پہلے رکشائیں جا بیٹھا تھا۔ ہم صبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے کسی طرح اُچک کر رکشے میں بیٹھ گئے۔ رکشہ چلنے لگا، ہم نے ٹماٹروں پر فاتحانہ نظر ڈالی۔ مغزدار، یہ سُرخ ٹماٹر یقیناً میٹھے ہوں گے۔ ہم نے سوچا، جاتے ہی چار، چھ تو یوں ہی اڑا دیں گے پھر ان کا کچھ مرنے کا پھر تھوڑی سی جیسی بھی ہم بنا رکھیں گے تاکہ ناشتہ اور مزہ دے۔۔۔۔۔ اچانک ٹوکرا رکشے کی کشتی سے پھسل کر سڑک پر گر گیا اور ہم ٹوکے کی جگہ آپڑے، پیچھے سے بھینسوں کا ”جم غفر“ آ رہا تھا جس میں سے ایک بھینس نے ہماری رکشہ کو دھک دے دیا تھا۔ ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کریں؟ رکشہ والے نے رکشہ بازو روک دیا اور کہا، بی بی آپ یہ ٹماٹے چن کر ٹوکے میں واپس ڈال دیں، ہم نے کہا واہ! بھلا ہم کیوں ڈالیں، تم رکھو نا!۔ رکشہ والے نے ڈھٹائی سے کہا، پانچ روپے اور بڑھ جائیں گے۔ ہم نے پوچھا کیوں؟ تو کہنے لگا اٹھا اٹھا کر رکھنے میں جو محنت لگتی ہے۔ ہم نے کچھ کم کرنے کو کہا مگر وہ نہ مانا، ابھی ہماری تھکار جاری تھی کہ بھینسوں نے دوڑتے ہوئے ہمارے سارے ٹماٹر روند ڈالے، ٹوکرا بھی مسطح ہو گیا۔ رکشہ والا سخت نالائق نکلا۔ بس دانت نکالے کھڑا تھا۔ ہمارے غم کی انتہا نہ تھی۔ جیلی اور کچھ مرنے کا کچھ ہمیں بن گیا تھا۔۔۔۔۔ ہم نے سوچا اگر ”مول تول“ کی بات نہ کرتے تو شاید ایسا نہ ہوتا، اُس وقت سے ہم نے تو یہ کر لی کہ کوئی ”مول تول“

کے جھیلے میں نہ پڑیں گے اور کسی طرح گھر پہنچ گئے۔

گھر میں افراتفری مچی ہوئی تھی۔ ہم نے بچوں سے پوچھا، کیا ہوا؟ بچے ہمیں دیکھ کر چونک بیڑے اور اپنے آبا جہان کو پکارنے لگے۔ ہمیں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ”ہمارے وہ“ بغیر استری کے کپڑے پہنے ہمیں نکلنے ہی والے تھے۔ ہمیں دیکھ کر چہرے پر کچھ حیرانی کے آثار نظر آئے۔ پوچھا کیسی ہو؟ زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟ ہڈی تو نہیں ٹوٹی؟ خون زیادہ تر نہیں بہہ گیا؟ ہم اب بھی نہیں سمجھے۔ پھر انھوں نے بتایا کہ پڑوس کا لڑکا جو دودھ لینے گیا تھا، اُس نے آکر اطلاع دی تھی کہ ہمارا ”ایکسڈنٹ“ ہو گیا ہے اور ہمیں بھینسوں نے روند ڈالا۔۔۔۔۔ ہاٹے! کیا بتائیں ہمارا ہنسی کے مارے بُرا حال تھا۔ گھر کا یہ وحشت ناک منظر، ہمارے سر کے اُکھڑے بال، اور ہمارے نامدار کے ایک پاؤں میں جوتا اور ایک پاؤں میں چپسل۔۔۔۔۔ اور اس طرح ہم، تنگ آ کے آخر ”مول تول“ کبھی نہ کرنے کا عہد کر بیٹھے۔

اچھا کیا نا؟

ہم اور ہمارے ڈاکٹر

ہمیشہ زبردستی مسکراتے رہنا یا دانتوں کی بے وجہ نمائش کرتے رہنے کو خوشی نہیں کہتے۔ اس کے باوجود ڈاکٹر ہمیشہ خوش رہنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ ہمیں یہ مسیحائی آج تک سمجھ میں نہیں آئی کہ ہم چاہیں کوئی بھی تکلیف بیان کریں، ڈاکٹر پہلے خوش رہنے کی تاکید کرتے ہیں اور بعد میں دوائیں تجویز کرتے ہیں، پھر اس کے بعد کچھ پریسز کی بھی ہدایت کرتے ہیں۔ اگر ہم مان لیں کہ خوش رہنا ہماری صحت کا ضامن ہے تو پھر یہ دوائیں کیوں تجویز کی جاتی ہیں؟ مختلف پریسز کیوں سمجھا ئے جاتے ہیں، اور تو اور وزن بھی دیکھا جاتا ہے۔ مختلف ٹسٹ وغیرہ بھی کروانے پر ہمیں آمادہ کیا جاتا ہے۔ آخر کیوں؟

کچھ دن پہلے ہم ذرا ایوں ہی "گردشِ دواں" کی زد میں آ گئے تھے۔ بات کچھ اہم نہ تھی لیکن حساس طبیعت نے ہمیں یقین دلایا کہ ہم ہی "شہر کے قاضی" ہیں۔ ہمیں چکر پر چکر آنے لگے، اختلاج ہونے لگا۔ کچھ عجیب الٹی پلٹی سی حالت ہو گئی۔ ہم ڈاکٹر کے پاس پہنچائے گئے۔ دوچار آلوں کی مدد سے ہمارا معائنہ ہوا۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ "گھبرانے کی بات نہیں، بیماری کچھ بھی نہیں ہے بس خوش رہیے!" ڈاکٹر صاحبان "خوش رہیے" اس آسانی سے کہہ دیتے ہیں جتنی آسانی سے یہ انجکشن کی سوئی چھو دیتے ہیں اور پھر ہم خوش رہنے کی کوشش ڈاکٹر

صاحب کے ”مطب“ ہی سے شروع کر دیتے ہیں۔ دوا کی تفصیل مسکرا کر پوچھتے ہیں، فیس بھی مسکرا کر ادا کرتے ہیں، سلام مسکراتے ہوئے کرتے ہیں اور ”مذا حافظ“ جیسے سنجیدہ موقع پر بھی مسکراہٹ سے گریز نہیں کرتے۔ یعنی اب یہیں سے ہماری خوشیوں کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ ہم بظاہر بڑے خوش ہو کر گھر لوٹتے ہیں۔ اور حسبِ ہدایت پیرہیز اور دوا کے مرحلوں سے گزر کر اپنے بستر پر آرام سے لیٹ جاتے ہیں۔ گھر والے اپنی ذمہ داری پوری کر کے بے فکر ہو جاتے ہیں اور گھوڑے، گدھے سب ہی بیچ کر سو جاتے ہیں۔ ہم بے قرار سے کروٹ پہ کروٹ بدلتے لگتے ہیں اور سوچنے لگتے ہیں کہ نہ جلنے ہمیں کون سا خطرناک عارضہ لاحق ہو گیا ہے کہ ہمیں خوش رہنے کی تائید کی جا رہی ہے۔ یہ تو بالکل آخری خواہش ہوتی ہے۔ انسان زندگی بھر اس خوشی کی تلاش میں دوڑ دھوپ کرتا ہے مگر یہ ملتی ہی نہیں اب ہم کس طرح خوشی ڈھونڈیں؟ کجیاں سے لائیں اس ظالم کو؟

خوش رہنا تو ہم جیسوں سے بہت مشکل ہے، البتہ ہم خوش رکھ سکتے ہیں بہت سے لوگوں کو۔۔۔۔۔

ایک مرتبہ ہمیں کسی عزیز کی عیادت کے لئے دواخانہ جانا پڑا۔ مریض کے نامراد دل نے خوشی کی تلاش میں اپنے آپ کو غم سے متاثر کر لیا تھا۔ وہ نیپارے مختلف تاروں اور مشینوں میں الجھے پڑے تھے۔ ان کے بائیں طرف چھوٹا سا لڈی بھی تھا جس پر فلم کی بجائے کچھ لیکریں متحرک تھیں۔ اُداس چہرہ، کسمپرسی کا عالم، آنکھیں مد کی طالب، بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ پھر بھی ہم آہستہ سے مسکراتے ہوئے ان سے بول ہی پڑے ”خوش رہیے“ مرض کچھ بھی نہیں ہے بس خوش رہا کیجئے“

اور خود بہت زیادہ مسکرانے لگے۔ ہمارے عزیز کے قریب کھڑے ہوئے اُداس
 اقریب آئے ہم پر قہر آلود نگاہوں کی بوچھاڑ کر دی اور ہم شرابور ہو کر مسکراتے
 ہوئے وہاں سے لوٹ آئے۔

ہم مسکرانے کی عادت ہمیں کچھ ایسی پڑی ہے کہ ہم کہیں بھی تعزیت ادا
 کرنے نہیں جاسکتے، وہاں بھی مسکراتے رہتے ہیں۔ لوگ ہمیں حقارت و ناگواری
 سے دیکھتے ہیں، یہی نہیں بلکہ ہماری دماغی حالت پر شک بھی کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحبان وزن کے بارے میں ہمیشہ تاکید کرتے ہیں کہ وزن بڑھنے سے
 پائے کم رکھے لیکن ہمیں وزن کم کرنا بالکل پسند نہیں، بھلا "ہلکے لوگ" سلاج
 میں کیسے زندہ رہ سکتے ہیں؟ اگر ہم بے وزنی کا شکار ہو گئے تو ہمارا مضبوط مقام
 کیسے بچے گا؟ اور خوش رہنے کے سارے راستے بھی مسدود ہو جائیں گے، یہناہ
 ہر طرح کے اسپیشلسٹ ڈاکٹروں کے پاس ہم جا چکے ہیں، سب کا متفقہ فیصلہ خوش
 رہنے پر ٹھہرا ہے اور ہم مسکراتے مسکراتے عاجز آ گئے ہیں۔ لوگ ہمیں پاگل سمجھ کر
 نظر انداز کرنے لگے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے کہ ہم ڈاکٹروں کے مشورے پر کسی
 طرح اور کب تک عمل کریں؟ ہمارا وہ کون سا عمل ہو سکتا ہے جس سے ہم حقیقی
 معنوں میں خوش رہ سکیں؟

"تہتم بیجا" سے ہمیں کئی بار پریشانی اٹھانی پڑی، اب کیا بتائیں
 آپ کو۔ ہم نے ایک فقیر کو راستہ چلتے چلتے ایک سکہ دیا اور مسکرا دینے۔
 فقیر نے وہ سکہ دیکھے بغیر ہی واپس کر دیا۔ ہم نے پوچھا تو کہنے لگا: "آپ کھوٹے
 سکے خیرات میں دیتے ہیں!" ہم نے کہا "ہرگز نہیں!" تو وہ پوچھنے لگا۔

”تو آپ یہ سکہ دینے کے بعد مسکرائے کیوں تھے ۔۔۔۔؟“

ہم ایک دفعہ آٹو میں کہیں جا رہے تھے۔ جب منزل پر اترے اور کرایہ دینے لگے تو کرایہ دیتے دیتے آٹو والے کو دیکھتے ہوئے مسکرا دیئے، اُس نے بہت دیر تک ہمارے دیئے ہوئے نوٹ الٹ پلٹ کئے اور بڑی ”معنی خیز“ نظروں سے ہمیں گھورنے لگا۔ ہم مسلسل مسکرا رہے تھے۔ آٹو والے نے کہا۔ ”یہ نوٹ جعلی ہیں اور آپ کے پاس یہ کیسے آئے؟“ ہم مسکرانا بھول گئے۔ ہم نے کہا! ”جعلی نہیں ہو سکتے، ہم نے یہ بینک سے لئے ہیں۔“ پھر آٹو والے نے پوچھا ”تو پھر آپ کی مسکراہٹ کا مطلب؟“ ہم نے کہا، ہم خوش رہنے کی عادت ڈال رہے ہیں، ہمارے ڈاکٹروں کا مشورہ ہے۔۔۔۔ ٹھیک کہا نا؟ ہمیں ڈاکٹروں سے بس یہی شکایت ہے کہ خوش رہنے کی تاکید تو کرتے ہیں، لیکن خوش رہنے کی ترکیب نہیں بتاتے۔۔۔۔۔

--

سہنس رہا تھا، پھر وہ سنجیدہ ہو گیا اور سرگوشی میں پوچھنے لگا، 'کیا چاہیئے؟' ہم نے اپنی دانست میں خشک گلے سے کچھ نکلنے کی کوشش کی اور ساتھ ہی کچھ کہنے کی بھی، مگر نہ "کہا نہیں جائے چپ رہا نہیں جائے" ... جیسی کیفیت طاری تھی۔ خوف تھا کہ جن ہم پر قابو نہ پا جائے، جن اچانک غائب ہو گیا پریمیاں تو پہلے ہی جا چکی تھیں۔ ہم نے دیپ کی اُن چمکتی دیواروں کو دیکھا جہاں سنہری نقش و نگار محل ہونے کا یقین دلا رہے تھے۔ ہم نے کچھ ہلکی سی گرمی محسوس کی اور گردن پھیر کر دیکھا تو اس دیپ کی نو سنہرے ہمیں لباس میں جھومتی ہوئی پری لگی۔ ہم نے اُسے اشارہ کیا تو وہ گھنٹیوں جیسی آوازیں بول اٹھی، جب تک ہوا کی پری اُگر تجھے بجھان دے میں کہیں نہیں جاسکتی۔

ہم نے بس یوں ہی اوپر منہ کر کے زور سے کہا "اے ہوا کی پری! اس آگ کی پری کو بجھا کر میرے پاس بھیج دے"۔ اچانک ہمارے بازو سے رنگ برنگے آنچل لہرانے لگے اور باد صبا کے جھونکے ہلکتے محسوس ہوئے۔ ہم نے دیکھا رنگ برنگے آنچل میں لمبی ہوئی ہوا کی پری اُگئی تھی، اور اپنی زلفوں کی جھک سے ہمیں مدہوش کر رہی تھی۔ اچانک گرمی ختم ہو گئی۔ وہ سنہری "شعلہ پری" غائب ہو گئی، ہم نے ہوا کی پری سے پوچھا، تمہارا نام کیا ہے؟ اُس نے کہا "صبا ہے میرا نام" اور مسکرا دی۔ دیپ میں رنگین پھول کھل اُٹھے ... اور آگے ایک دیوان جو ٹھکریوں کی منہ سے آراستہ تھا نظر آیا، صبا ہمیں لے اڑی اور اُس منہ پر بٹھا دیا، ہمارے کیا ماحول تھا، بہت بڑے بڑے گلاب کی پتیوں کے لمس سے بڑی راحت محسوس ہوئی۔ پھر ہمیں ایک تستلی اڑتی نظر آئی، یہ بہت بڑی اور بانگی، سمیٹلی تھی۔ اس کے ہاتھ میں مرا جی تھی اور پیغام بھی، وہ ہمارے

پاس آکر بیٹھ گئی اور جام میں کوئی خوشبودار شے اڑیلنے لگی۔ پھر ہماری طرف جام بڑھاتے ہوئے کہا ”پیو“۔ ہم نے پوچھا ”یہ کیا ہے؟“ تو کہنے لگی۔ ”یہ پھول کا رس ہے جو ہم اپنے مہانوں کو پلاتے ہیں“ ہم پھولوں کے رس کی بات سنتے ہی جام پر ٹوٹ پڑے، اللہ، کیا مزے دار رس تھا، ہم نے تقریباً ساری مراحی خالی کر ڈالی اور بڑے سے گلاب کے شبنمی گاؤں تک یہ پیر سر رکھ کر سو گئے۔

نہ جانے کتنی ساعتیں گزری، کتنی صدیاں گزریں، ہم گرمی سے جاگ گئے آف، ہم پسینے میں بھیگ رہے تھے اور وہ ”مسند نعل“ مڑ جانے لگی تھی۔ ہم نے پھر اُس گوشے کی طرف دیکھا، وہاں ”شعلہ پری“ دمک رہی تھی۔ ہم نے اُسے اشارہ کیا، وہ رقص کرنے لگی، ہمیں ایک سیاہ لبادے میں لپیٹی ہوئی پری آکر اپنے ساتھ لے گئی جہاں چاند ستاروں کی مسند سجی تھی، ہمیں وہاں بیٹھا دیا گیا، ہماری شان بڑھ گئی تھی۔ ایک ”ستارہ پری“ ہمارے آگے دو زانو ہو کر بیٹھ گئی اور کہا، ”آپ ہماری مہمان ہیں آپ کو کیا چاہیے، حکم کیجئے ورنہ ہمارے محبوب“ آجائیں گے۔ ہائیں یہ کیا ہمارے محبوب، ہمیں فلم ”میرے محبوب“ کی حد تک ہی معلوم تھا لیکن یہ ”ہمارے محبوب“.....“ تو پری بولی، ہم تمام پریوں کا ایک ہی محبوب ہے اُسے پریاں بہت پسند ہیں، وہ ہمیشہ ہمیں قید میں رکھتا ہے، ایک حصہ بنا رکھا ہے، ہم اُس سے آگے نہیں جاسکتیں۔ دراصل ہمارے محبوب کی عادت ہی ایسی ہے کہ وہ کسی کو پسند کر لیں تو قید کر لیتے ہیں۔ ہمارا دل دھڑکنے لگا، پھولوں کا رس بڑی تیزی سے رگوں میں گردش کرنے لگا۔ ہمیں اپنے شوہر اور بچوں کی یاد آگئی، ہم بہت ہی بیخودہ ہو گئے اور پو پڑے ہماری آنکھ سے جو بھی آنسو گر رہے تھے وہ پریاں مختلف نقرئی تھالوں میں محفوظ کر رہی

تھیں، کچھ دیر بعد وہی دل کا ہالہ نمایاں ہوا، اور وہی جن ہمارے سامنے تھا۔ پیرویوں
 نے جن کے سامنے ہمارے اشکوں کا فِرقی تھاں رکھا، جہاں ہمارے آنسو یا قوت
 و زور بنے جگمگا رہے تھے۔ جن حیرت سے دیکھنے لگا، پیرویوں نے بتایا کہ یہ ہمارے
 آنسو ہیں، کیا؟ آنسو؟ جن بھرائی ہوئی آواز میں بولا، جی ہاں! پر
 بیک وقت بول پڑیں، تعجب ہے، ایسے لعل و گہر تو میرے خزانے میں بھی نہیں، خیر!
 یہ سب ہمارے خزانے میں داخل کر دو۔ ہم نے کہا، ٹھہرو! یہ لعل و گہر ہمارے ہیں
 تم اسے ہماری اجازت کے بغیر نہیں لے سکتے۔ جن نے پوچھا، تمہیں کیا چاہیے؟
 ہم نے کہا، آزادی۔۔۔۔۔ جن نے قطعیت کے ساتھ کہا، نہیں، ہم ایسے نادر لوگوں
 کے دیوانے ہیں جن کے اشک، لعل و گہر ہوتے ہیں، ہم کھسیا نے چنڈ میں خواہ مخواہ
 ہنس پڑے۔ بے شمار موتی ہمارے منہ سے نکل کر بکھر گئے، جن کی آنکھیں حیرت
 سے پھٹی رہ گئیں۔ اشک، یا قوت و زور، تبسم، موتی واہ واہ۔۔۔۔۔ آج سے ہم
 آپ کے غلام، جن ہمارے آگے عقیدت سے جھک گیا۔ آپ کا جواب نہیں، ہم
 آپ کی قدر کرتے ہیں، آپ سے محبت کرتے ہیں، یہ پریاں، یہ محل سب آپ کی نذر
 ہیں۔ آپ کی ہر شرط ہمیں منظور ہے۔ جن پچھلے جن اشک انداز میں بولتا جا رہا تھا اور
 ہم اپنے آپ کو مقابلہ کرنے کے لئے دل ہی دل میں تیار کر رہے تھے۔ سوچا کہ جن
 اب ہمارے دام میں آگیا ہے، کیوں نہ پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ ہمیں اپنے گھر کی
 یاد بے قرار کر رہی تھی۔ ہم اچانک "ادالہی کے میدان" میں اتر آئے اور جن سے اپنی
 آواز کی لرزش کو چھپاتے ہوئے کہنے لگے۔ ابھی تو آپ نے دیکھا نہیں، اک ذرا ہمیں
 اپنا دنیا میں بھیجئے، دیکھئے ہم اور کیا کیا لاتے ہیں، ہمارے گھر میں درِ غلطاں بھی ہیں۔۔۔

... جن بڑا حریف تھا۔ اُس نے کہا اگر آپ واپس نہ آئیں گی تو ہم آپ - بردستی اٹھالائیں گے اور اندھیرے قید خانے میں ہمیشہ کے لئے بند کر دیں گے۔ ہم نے کہا ہم وعدہ کرتے ہیں۔ جن نے جہدِ وفا کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا جس کے لیے ناخن تلوار کی طرح تھے۔ ہمیں اداکاری کے جوہر دکھانے تھے۔ ہم نے اپنا ہاتھ جن کے ہاتھ میں دینے سے پہلے کہا کہ پہلے آپ وعدہ کریں ہمیں کبھی کوئی نقصان نہ پہنچائیں گے، بقول خود آپ کے آپ ہمیشہ ہمارے غلام رہیں گے، جن نے وعدہ کیا۔ ہم دل ہی دل میں خوش ہو گئے کہ اب ہم بہترین اداکاری پر ایوارڈ حاصل کر سکیں گے۔ ہم نے جن سے کہا ہماری دنیا میں لے چلتے۔ جن نے ہمیں حسرت بھری نگاہ سے دیکھا اپنے گلے سے ایک ہار نکالا جو بے حد فنی تھا اور ہمیں "ورمالا" کی طرح ہار پہنا دیا ہار کے وزن سے ہماری حراچی دار گردن لچکنے لگی۔ ہم بہر حال برداشت کر رہے تھے۔ پھر ہمیں سب پیروں نے مل کر بڑے خوبصورت انداز میں رخصت کیا۔ شعلہ پری چلائی میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی اور ایک ہی لمحے میں ہمارے قریب آگئی پھر ایک ستارہ نما پالکی آئی جس میں ہم بیٹھ گئے۔ جن نے ہمیں حسرت سے دیکھا اور پالکی کو اشارہ کر دیا۔ یہ پالکی پچاند تاروں کے درمیان سے گزرنے لگی۔ اچانک ہمیں محسوس ہوا صبا کے رنگیں آجکل کی ہسکتی ہوا ہمارے رخساروں کو چھو رہی تھی۔ ہم نے ادھ کھلی آنکھوں سے جائزہ لیا۔ ہمارے سر تاج ہمارے منہ پر پانی کے قطرے ٹپکا رہے تھے، ہمارے جگر گوشے پلکھا جھل رہے تھے۔ صبح ہو چکی تھی۔ اُجالوں کی ابتدائی ساعتیں تھیں۔ چھوٹی لڑکی نے کہا، آتی، آپ نے خواب میں کیا دیکھا؟ ہم نے کہا جن اور پریاں، ہمارے سر تاج بول اُٹھے بیٹھا دیکھ بھول گے۔ رات کو تم نے "اونینڈا" ٹی۔ وی کا اشتہار بہت غور سے دیکھا تھا نا!

”تہذیب کے انڈے“

تہذیب کے انڈوں کا نام سن سن کر ہمیں بھی ان انڈوں کا شوق ہوا۔ دوستوں سے پوچھا تو ہنس دیئے، عزیزوں سے پوچھا تو پاگل کہہ گئے۔ غرض کہ ہماری خواہش ”سنی ان سنی“ کر دی گئی۔ ہمیں کسی نے نہیں بتایا کہ یہ انڈے کہاں ملتے ہیں؟ ہم نے کئی بڑی بڑی دوکانیں چھان ماریں، چھوٹی چھوٹی دوکانوں کو بھی نہیں چھوڑا، لیکن ”تہذیب کے انڈے“ نہیں ملے۔ ان کی عدم دستیابی سے ہمیں ان انڈوں کی اور بھی خواہش بڑھ گئی۔ آخر شہر کے گنجان ایک علاقے میں ایک گلی کے آخری سرے پر ایک ایسی دوکان ہمیں نظر آئی جو بالکل خالی تھی۔ مطلب یہ کہ اس دوکان میں کوئی شے بھی نہیں تھی جسے قابلِ خرید یا فروخت سمجھا جائے۔ اس خالی دوکان میں ایک اسٹول پر ”حضرت خضر“ کی طرح ایک ”بارش بزرگ“ بیٹھے اپنی نیم وا آنکھوں سے ہمارے تجسس کا اندازہ ہمارے چہرے سے لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔

ہم قریب پہنچے تو ”حضرت خضر“ نے ہمیں ”السلام علیکم“ کہا۔ ہم نے سلام کا جواب اسی طرح دیا اور دل میں تادم ہوئے کہ اس مارہم نے بڑی بد تمیزی کر ڈالی ہے ورنہ سلام میں ہمیشہ ہم ہی پہل کرتے آئے تھے خیر! سلام کے بعد کلام بھی انھوں نے ہی کیا۔ ”کیا چاہیے؟“ ہمیں اپنی نامعقولیت کا چھین ہو گیا کہ

ہم جسے خالی دوکان سمجھ بیٹھے ہیں، وہ خالی نہیں ہے، ورنہ "حضرت خضر" ایسا سوال کیوں کرتے؟

ہم نے بڑے ادب سے کہا، "ہمیں تہذیب کے انڈے چاہیے۔۔۔۔۔"

"حضرت خضر" کا کرڑک دار قہقہہ ہمیں لڑا گیا۔ وہ مسلسل قہقہے لگا رہے تھے۔ ہم نے اُن کے منہ کی طرف دیکھا، جہاں دانتوں کی قطار کے بدلے مسوڑھوں کے نشان اُس نومولود بچے کی یاد دلا رہے تھے جسے کھجور سے زہر دیتی سسہہ پٹایا جاتا ہے۔ دما دیر میں جب اُن کے قہقہے تھکے تو انھوں نے پوچھا۔ "کیا کرنا ہے تہذیب کے انڈوں کا؟"

ہم نے عرض کیا، "جی ہم ناشتے میں آملیٹ اور رات کے کھانے میں پڈنگ کھانے کے عادی ہیں، اگر تہذیب کے انڈے مل جائیں تو خدا ذائقہ بدلیے گا اور شائد تاشیر بھی! ہم شائد تہذیب کے انڈے کھانے کے بعد صبح معنوں میں صحت مند ہو سکیں گے، کیا آپ ہماری مدد کر سکتے ہیں؟"

"جناب خضر" کی آدھ کھلی آنکھوں پر جھکی ہوئی گھنی بھینوس لمبہ بھر کے لئے "بلائی" ہو گئیں اور وہ بے نیازانہ فرمانے لگے۔ تہذیب کے انڈے ویسے تو یہاں ملتے نہیں لیکن میں آپ کو ضرور دوں گا، میری کچھ شرائط ہیں، اگر آپ منظور کر لیں تو پھر تہذیب کے انڈے آپ کے ہوں گے۔ ہم نے جی جلدی سے ان کی شرطیں ماننے کا اقرار کر لیا، تب "حضرت خضر" نے فرمایا۔ جب کبھی یہاں آجائیں، چاہے بے وقت ہی کہیں نہ آئیں ان کی خاطر کی جائے، ان سے میزبان ہرگز نہ ہوں۔ اگر کوئی آپ کی کبھی خوبی سے جتنے لگے تو اپنے گھنڈے سلوک سے

اُس حصہ کی آگ کو بجھا ڈالو، اگر کوئی آپ کی شان میں گستاخی کر کے طمانچہ مار دے تو دوسرا رخسار بھی آگے کر دو۔ ہمارے ہاتھ بے اختیار ہمارے رخسار کی طرف بڑھ گئے، ہمیں اپنے رخساروں پر طمانچے کے بعد والی "جلن" کا احساس ہوا۔ پھر بھی ہم سعادت منہ شاگرد کی طرح اقرار میں سر ہلاتے رہے۔ پھر جناب خضر نے فرمایا کہ پڑوسیوں کا حال پوچھتے رہو، ان کی ضرورتوں پر نظر رکھنا چاہیے وہ کسی مذہب کے ہوں یا کسی مرتبے کے ان سے اپنے قربات داروں کی طرح پیش آؤ۔ "سو تو ہم کرتے ہیں" درمیان میں ہم بے ساختہ بول پڑے۔ خضر نے کہا ٹھیک ہے اب یہ بتاؤ کہ تہذیب کے اندے کتنے چاہیے؟ ہم نے کہا، بہت سارے دے دیجئے نہ ملنے والی شے کا محفوظ کر لینا ہی بہتر ہے۔ خضر نے پوچھا، گندے ہو جائیں تو؟ ہم نے کہا، ہم اندے گندے نہ ہونے دینے کا پُنز جانتے ہیں۔ تو خضر نے کہا "پہلے" آملیٹ "بنے گا یا پہلے" پیڈنگ؟ ہم نے کہا "پہلے آملیٹ، پھر پیڈنگ۔"

تو بولے۔ "خدا بھلا کرے انگریزوں کا جو آملیٹ اور پیڈنگ تو سکھا گئے مگر خوش اخلاق مُرغی کا وہ نسل اپنے ساتھ لے گئے جو تہذیب کے اندے دیا کرتی تھی اور ہم اُس زمانے میں آملیٹ یا پیڈنگ کے عادی ہرگز نہ تھے۔ ہم مشرقی انداز میں جینے والے لوگ مشرقی کھانے ہی کھایا کرتے تھے۔ آج کل تو ہماری تہذیب کا سورج مغرب سے نکلنے لگا ہے، اس لئے تہذیب کے اندے مل نہیں پا رہے ہیں۔"

ہم خضر کے وعظ سے بے زار ہو چکے تھے، پھر کہا "کہاں ہیں اندے؟"

اب تو دیجئے ہم نے آپ کی تمام شرطیں مان لی ہیں نا؟ اور بتائیے کہ پیسے کتنے دیں؟“

تو خضر نے کہا: ”شرطوں پر عمل کرنے کے بعد آپ کو ہتھ چل ہی جائے گا کہ تہذیب کے اندازے کتنے قیمتی ہوتے ہیں؟“ اور جناب خضر نے ادھ کھلی آنکھیں پوری بند کر لیں، آٹومیٹک اُن کا منہ بھی بند ہو گیا۔ شاید آنکھوں اور منہ کا ایک ہی کنکشن تھا۔

ہم ”تہذیب کے اندازوں“ کے بارے میں سوچتے ہوئے لوٹ آئے۔۔۔۔۔

سامنا پانی کی قلت کا

ہم آدم سے بیٹھے عطر کی چھوٹی چھوٹی خالی شیشیوں میں پانی بڑی نفاست سے بھرتے جا رہے تھے۔ ہمارے سرتاج نے دیکھا تو پوچھا، یہ کیا ہو رہا ہے؟ ہم نے جواب دیا جی وہ عید کی تیاری، بقرعید آرہی ہے نا.....! عید کی تیاری؟ بھلا ان عطر کی خالی شیشیوں میں پانی بھر کر کیا کرنا ہے؟ انہوں نے پوچھا تو ہم نے منانت سے کہا، کرنا کیا ہے، پانی کی قلت ہے نا اس لئے اب کے ہم عطر کے بجائے شیشیوں میں پانی بیش کریں گے سب کو انسان تو خاک سے بنا ہی ہے اگر یہ پانی عطر کے طور پر لگا لیا جائے تو کبھی سحر انگیز خوشبو ہوگی سوچئے نا۔ ویسے مٹی کا عطر بھی بڑا قیمتی ہوتا ہے لیکن لوگ پیسے برباد کرتے ہیں وہ بھی عطر خرید کر، پانیوں بھی آج کل سستا ہے کیا؟ پانی بھرتے کے لئے سرکاری نلوں پر جان کی بازی لگانی پڑ رہی ہے۔ گھر میں کے نلوں سے تو اب سسکیاں بھی کبھی کبھی ہی سنائی دیتی ہیں، وہ دور بھی نہیں رہا جب قطرہ قطرہ سمندر بن جایا کرتا تھا آج قطرے ہی ناپید ہو چکے ہیں۔ بے چارے سرتاج ہمارے اس بیان پر حیران ہوتے ہوئے ہم پر تذبذب اور ترحم کی نظر ڈال کر خاموش ہو گئے۔ ویسے بھی شدید گرمی کی لہر جاری تھی۔ انہوں نے ہم سے مسئلہ پھر کوئی سوال نہیں کیا۔

در اصل پانی کی قلت اور گرمی کی شدت کے بارے میں ہم کافی غور و فکر کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ چاہے کچھ ہو تدبیر کا ساتھ نہیں چھوڑنا ہے، بقول شاعروں کے آج کل سبھی کے ہونٹوں پر یہی اس جم لگئی ہے، آنکھوں کے دریا خشک ہو چکے ہیں۔ اور تو اور جب ہمیں یہ معلوم ہوا کہ شہر کے مرکزی تالاب بھی سرابوں کا منظر پیش کر رہے ہیں تو ہماری آنکھوں میں آنسو آگئے لیکن پلکوں ملک آتے آتے وہ بھی ہوا ہو گئے۔ ”باور آیا، ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا۔“ کسی ہندی شاعر نے کہا تھا ”تیرے گھر کے تین پانی نہ ہو تو یہ سنگھٹ سے بھر لا۔۔۔۔۔ لیکن وہ سنگھٹ ہمیں نظر نہیں آتے جہاں اس ”دد ناک“ موقع پر ہمیں ”چٹو پھر پانی“ ہی مل جائے۔ ہم سوچ رہے ہیں، یوں نہ ”راگ ملہار“ ان گھڑوں کو بجا بجا کر ہم خود ہی شروع کریں جو عرصے سے خالی رکھے ہیں۔ شاید ابر حرم کی خفگی دور ہو ہی جائے اور برس پڑے ہم پر۔ ہماری سیاسی زمین پر سوکھے تالاب پھر سے ”قربادگی نہر“ بن جائیں۔۔۔۔۔ ہم اچھے بھلے لوگوں کو سڑکوں پر ”شراقت کا لبادہ“ اوپر چڑھا کر یعنی کہ پانچے اوپر چڑھا کر بڑی بڑی بالٹیوں میں پانی بھر کر لڑکھڑاتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ گنگا جمنی تہذیب کے اس شہر میں ایسی لہر ہم برسوں بعد ہی دیکھ رہے ہیں۔ جب کبھی ہمارے غل میں پانی آتا ہے تو بقول شاعر ”نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز“ ہم اور ہمارے ملازمین ”مساوات“ اختیار کرتے ہوئے پانی بھر لے لگتے ہیں حالانکہ ”دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل“ مگر اس درد کے غل بھی بہت بے وفا ہو گئے ہیں نہ جانے ہمیں کب ”سوکھے“ کا سامنا کرنا پڑے۔ گھر کے اس کونے

سے دوسرے کونے تک ہاتھوں میں مختلف سائز کے برتنوں سے پانی بھر بھر کر محفوظ رکھنے کے لئے ہم نہ جانے کتنے چکر لگا لیتے ہیں۔ یقین کیجئے اگر ان چکروں کا حساب کیا جائے تو ایک حج کا ثواب تو فرو مل جائے گا۔

ہم نے ایک شادی کے ولیمہ کارڈ پر ”جلی حروف“ میں لکھا دیکھا کہ ”براہ کرم اپنے پینے کا پانی اپنے ساتھ لائیں“ دعوت صرف ”طعام“ کی ہے پانی کی نہیں، حالانکہ ”آب و دانہ“ نصیب کا ہوتا ہے۔ ہمارے پڑوسی اور جنرل اسٹور والے صاحب، دھوبن، ہماری بلڈنگ کے لفٹ مین، وایچ مین اور صفائی کرنے والے صاحبان کو ہمارے ہی گھر کا پانی لگتا ہے۔ انہیں پانی بھرنے کی فکر کبھی نہیں رہتی، وہ سب اپنی ضروریات کے لئے ہم سے پانی مانگ لیتے ہیں بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا ”ہم پانی بھر رہے ہیں ان کے لئے“ سنا پانی کی قلت کا ہے تا۔۔۔۔۔!

سیاست - ۱۴ جون ۱۹۹۳ء

”ہم اور مکھی“

معلوم نہیں یہ ناک پر مکھی والا غار کب سے عام ہے لیکن ہم تو حلیفہ
 کچھ رہے ہیں کہ ہم کبھی بچ اپنی ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے اور اس کی انتہائی
 معقول وجوہات بھی آپ کو بتائیں گے۔

مکھی کے ایک پیر میں ”شفا“ اور دوسرے پیر میں ”شفا“ (ہلاکت) ہوتی
 ہے، پھر بھی ہم اس زبردستی نہیں آنا چاہتے۔

ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دفعہ ہماری ناک پر مکھی نے بیٹھنے کا فیصلہ کرتے
 ہوئے غلیّٰ قدم بھی کر لیا تھا، ہم اس وقت آم کھا رہے تھے۔ ہم نے اسے اڑانا
 یہاں تو آم ہاتھ سے پھسل گیا، ہم گرے ہوئے آم کو حسرت سے دیکھ ہی رہے تھے کہ
 وہ مکھی پھر ہماری ناک پر آ بیٹھی۔ ہمیں سخت غصہ آیا۔ گویا ہماری ناک نہ ہوئی
 بلکہ ”بلا تھوریم“ ہو گئی، جہاں بیٹھ کر ادنیٰ سی مکھی ہماری آنکھوں کے کہکشی منظر
 سے لطف اندوز ہونا چاہتی ہے۔ ہمارا غصہ بڑھنے لگا۔ ہم نے اس زور سے ہاتھ ہلایا
 کہ ہمارا جسم سارے کا سارا لرز کر رہ گیا مگر کم بخت مکھی ہماری ناک سے ہی چپکلی رہی۔
 ہم نے ماہر ”چڑی مار“ کی طرح اپنی ناک کا نشانہ لیتے ہوئے ہاتھ بڑھایا جہاں
 مکھی قریب سے ہمیں ”خونخوار گدھ“ کے برابر نظر آرہی تھی، جیسے ہی ہمارا ہاتھ ناک
 پر پڑا مکھی نکل گئی اور ہاتھ ناک پر اس زور سے پڑا کہ دم بھر کو ہلدی سانس رکتی

غسوس ہوئی۔ مزید جھٹا ہٹ میں ہماری نظر اپنے دامن پر پڑی جہاں ناک سے ٹپکتا ہوا خون "قطرہ قطرہ دریا" بننے جا رہا تھا۔

بس، خون پر نظر پڑتے ہی ہمارا دماغ چوہٹ ہو گیا۔ کم بخت مکھی
 "بھن بھن" کرتی پھر ناک کے پاس آئی اور ہم نے اس "خون ناحق" کا بدلہ لینے کے لئے
 ایک زوردار ہاتھ مارا۔۔۔۔۔ مگر مکھی تو صاف پنج نکلی لیکن ہاتھ پھر سے غلط نشانے
 پر پڑ گیا یعنی پاس رکھے ہوئے دودھ کے گلاس پر، ایک پھنکا ہوا اور شیشے کے
 ٹکڑے بکھر گئے۔ ہم آم کھا کر دودھ پینے کے عادی ہیں۔ لیکن آم پھسل گیا اور دودھ
 گر گیا، پھر بھی مکھی ہاتھ نہ لگی، خون مسلسل ٹپک رہا تھا۔ اس کم بخت مکھی نے ہمارا
 اتنا خون بہا دیا لیکن ہم اس کا ایک "پیر" بھی نہ بگاڑ سکے۔ قریب آتی ہوئی مکھی کے
 پیچھے ہم پھر دوبارہ لپکے۔ اب کی بار مکھی کے اڑنے کا انداز ہمیں چیلنج کر رہا تھا۔
 ہم نے اس قص کرتی مکھی کو دونوں ہاتھوں کے درمیان لے کر زور سے تالی بجا دی،
 تالی ماشاء اللہ کافی زوردار تھی۔ جب دونوں ہاتھوں کو دیکھا تو سکھ کی طرح حالی ہاتھ
 تھے۔ مکھی تالی کے باوجود ہاتھ نہ آسکی۔ اب ناک سے خون کے قطرے زیادہ ہی گرنے
 لگے تھے۔ ہم نے سر پر ذرا سا پانی ڈالا اور وہیں پڑے صوفے پر بنائیکے کے لیٹ گئے۔
 ہمارا لیٹنا مکھی کو بھلا کیسے بھاتا؟ وہ پھر بھنجنے لگی ہوئی ہماری زخمی ناک
 پر بیٹھ گئی۔ ہم نے بڑی احتیاط سے اپنی اکلوتی ناک دونوں ہاتھوں میں دبوچ لی اور
 خالی منٹھیوں کو بھینچ کر کھول دیا، ہم سمجھے کہ مکھی کا شاہد جنازہ نکل گیا، لیکن
 بروں میں طاقت پر واز رکھنے والی مکھی اب بھی ہماری معرفت میں نہ آسکی، مگر ناک
 بے چاری کا نقشہ بدل گیا۔ ہم تکلیف سے کراہتے ہوئے سامنے سنگھار میز کے آئیے میں

پتا جائزہ لینے لگے۔ ناک بے چاری کافی پھول گئی تھی۔ خون بہنا کم تو ہوا تھا، لیکن چہرے سے ہم باکسر لگ رہے تھے۔ قریب ہی پھر سے بھنھٹا ہٹ سنا دی ہم حملہ کے بجائے اس بار دفاع کے بارے میں غور کرنے لگے۔ ہاریک جالی دار دوپٹہ منہ پر لپیٹ لیا، جیسے آخری دیدار کے بعد کفن پلپٹ دیا جاتا ہے۔ دوپٹہ بہت ہی ہاریک جالی کا تھا۔ اس لئے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ مکھی ہماری ناک کی تلاش میں اب بھی مرگواں ہے۔ اسے غالباً اندازہ ہوا کہ ہماری ناک "ہمیں نہیں" ہے۔ وہ قریب آئی تو ہماری دفاعی حکمت عملی "شب خون" مارنے پر اُتر آئی۔ ہم نے پھر زور سے اس پر بھینٹا مارا۔ ہمیں منٹھی میں کچھ حرکت محسوس ہوئی، ذرا سا کس دینے کے بعد ہم نے منٹھی کھولی تو بسل کی طرح اُدھ مری ظالم مکھی ہماری ہتھیلی سے چسکی ہوئی تھی۔ ہم نے دوپٹہ چہرے سے ہٹا دیا اور اسے سخت سے دیکھنے لگے۔ ہم ابھی اس "نیم جاں مکھی" کے بارے میں غور کر ہی رہے تھے کہ کم بخت ایک دم سے اڑ کر ہماری ناک پر دوبارہ آئی منٹھی شاہ اُسے ہماری ناک سے جنوں کی حد تک عشق ہو چکا تھا.....!

پاس رکھے ایک ضمیمہ رسالے سے ہم نے خود اپنے منہ پر اتنے طلاپختے لگا ڈالے کہ مکھی تو مکھی اگر سانپ بھی ہوتا تو یقیناً مر گیا ہوتا.....!

اس کے بعد ہم نے کراہنا شروع کیا۔ ناک سے دوبارہ خون بہنے لگا اور درد سے حالت کی بے حالت ہونے لگی۔ کسی نے ہماری آواز سُنی، ہم کو صرف اتنا یاد ہے کہ خادمہ کبہ رہی تھی: "صاحب! دیکھئے لی بی جی زخمی ہو گئیں"۔ اس کے بعد ہمیں ہر شس نہ رہا.....!!!

”کرفیو“

سڑکیں ہمارے دل سے بھی زیادہ سنسان تھیں۔ مگر سوئی بھی پھینک دی جاتی تو یقیناً اُس کی آواز بھی گونج اُٹھی۔

ہم ہمیشہ ”برائی“ کے پہلو میں سوئی ہوئی ”خوبی“ کو ڈھونڈ لیتے ہیں اور اُسے پوری طرح بیدار کر دیتے ہیں۔ اب یہی دیکھئے نا، کرفیو کے اذیت ناک اور دردناک پہلو میں خوابیدہ ایک خوبی آخر ہم نے ڈھونڈ ہی لی۔ ہر عمر اور ہر مذہب کے لوگ کرفیو کی وجہ سے ذہنی انتشار میں رہتے ہوئے بھی زندگی کی ضرورتوں کو کسی نہ کسی طرح پوری کرتے ہی رہتے ہیں۔ خاص طور پر ہم خواتین تو ماحول کو سازگار بنانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں، ہے نا!

ہمارے پڑوس میں غالباً مونگ کا حلوہ بن رہا تھا، خوشبو بے چین کئے دے رہی تھی۔ ویسے بھی ہماری ”قوتِ شام“ غیر معمولی ہے اور پھر کرفیو تو انسانوں پر نافذ ہوتا ہے۔ خوشبو پر تقوڑ اسی نافذ ہوتا ہے؟ ادھر کی خوشبو ادھر اُدھر کی خوشبو ادھر۔۔۔ خیر! ہمارا دھیان سارا کال بیل کی طرف تھا کہ بس اب بیل بجے گی اور پڑوسن بھابی ہمارے دروازے پر حلوے کا حصّہ لئے کھڑی ہوں گی۔۔۔۔۔۔ اور پھر ہوا بھی ایسا، اُنھوں نے حلوے کا حصّہ پیش کرتے ہوئے ہم سے سوال کیا کہ ”تم نے کرفیو میں کیا کیا پکا یا؟“ ہم نے بتایا کہ ہم نے

صرف دہی بڑے اور سوسے ہی غربی موافق بنائے ہیں، بیٹھا تو ہم نہیں بنا سکے اور اس طرح پکوان کا تباہ ہوتا رہا۔

اس کے بعد ہمارا پروگرام اڑوس پڑوس کے گھروں میں بیٹھ کر حالات حاضرہ پر سیاسی لیڈروں کی طرح تبادلہ خیال کرنے کا تھا۔

گنجان آبادی والے شہروں میں ہنگامہ کوئی عجب بات نہیں۔ اس ہنگامے کو روکنے کے لئے اگر کریفو نافذ ہو جائے تو ہمیں اتنی تو فرصت مل جاتی ہے کہ کچھ مزیدار کچوان کر کے پڑوسنوں سے ”گپ شب“ کر کے وقت گزاریا جائے۔ عام طور پر کریفو میں ہماری قابلیت میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ وہ سیاسی صلاحیتیں بھی اجاگر ہونے لگتی ہیں جنہیں ہم کبھی سراٹھانے کا موقع نہیں دیتے۔ ہم اپنے پڑوسوں میں اسی لئے بے حد مقبول ہیں اور ہمارے خوش حال پڑوسی کریفو کے منتظر رہتے ہیں تاکہ وہ ہماری ان صلاحیتوں سے مستفید ہو سکیں جو ہمیں شانڈ کسی وقت قوم کا ”لنڈر“ بنانے میں کارآمد ہوں گی۔

ہمارے پڑوسیوں کا خیال ہے کہ ہم الیکشن میں بغیر ”بے ساکھی“ کے کھڑے ہو سکتے ہیں۔ ہاں! تو ہم کریفو کے دوران مزیدار پکوان کر کے لطف اندوز ہونے کے بعد کسی پڑوس کے یہاں وقت گزارنے چلے جاتے ہیں، جیسے بڑی شخصیتیں گروما کے موسم میں ٹھنڈے مقامات پر جایا کرتی ہیں۔

ہم اپنی پڑوسنوں سے تبادلہ خیال کرتے ہیں۔ جھگڑے، فساد اور افواہوں کے تذکرے کرتے ہوئے ان غریبوں کی یاد بھی یاد دلاتے ہیں جو کریفو کی وجہ سے مزدوری کے بغیر گھر میں فاقے کر رہے ہوتے ہیں اور ہم ایسے موقع پر کچھ ایسی درمندی

سے بیان شروع کرتے ہیں کہ سننے والوں کی آنکھوں سے دم جھم شروع ہو جاتی ہے، ہم بھی اپنا دامن بھگو لیتے ہیں۔ ہم انتہائی خلوص کے ساتھ پڑوسنوں سے غریبوں کی مدد کے طالب ہوتے ہیں اور ہمارا دست طلب آگے بڑھا دیتے ہیں۔ خدا کی حیرت میں اناج، پیسے، کپڑے اور برتن جمع ہو جاتے ہیں اور ہم اپنے امدادی قافلے کے میر کارواں بن کر نکل پڑتے ہیں۔

جب ہم اپنی نظر سے ملک کے حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اپنے وطن عزیز پر پڑا ریم آتا ہے۔ ہائے یہ ثبت بھرے رنگ بھرے گلستاں ہیں "ٹڈی دل" کی طرح اقدار کی تمنا حلقہ آور ہو کر ماحول کو کس قدر ویران کر دیتی ہے۔

کسی جہان دیدہ پڑوسن کے منہ سے چند تسلی آمیز جملے سن کر ہم مطمئن ہو جاتے ہیں کہ بقول ان کے کرفیو کے لیے جھگڑے بند ہو جائیں گے اور پہلے کی طرح پھر سے حالات نارمل ہو جائیں گے اور اس احساس کے ساتھ ہمیں مونگ کا حلوہ پھر یاد آ جاتا ہے اور ہم پھر وہاں سے کام کا بہانا کر کے حلوے والی بھابی کے پاس جا دھکتے ہیں۔ ہماری بڑی آؤ بھگت ہوتی ہے۔ ویڈیو پر ابھی سی فلم لگا کر ہمیں روکنے کے انتظامات کرتے ہوئے حلوے والی بھابی بھی سیاست بگھارنے پر تیار جاتی ہیں۔ "بھئی" اب یہ حالات ہے نہیں جاوت ہیں من بڑا یو جھل ہوا جا رہا ہے یو جا کر کے من بہلانے کے لئے میں نے حلوہ بھون لیا تھا۔ حلوے کی یلیٹ صاف کر کے ہم دوسری بھابی کے یہاں جا پہنچے جہاں پر نشانی کباب بن رہے تھے۔ کچھ یہاں بھی اُن کے گھر کرفیو کی وجہ سے پھنس گئے تھے۔ بہر حال وہاں بھی ہمارے لئے کرسی موجود تھی۔ کرفیو پر کچھ پریشانی اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے ہم نے کچھ کھانے سے بظاہر کام رگ تو جاتے ہیں مگر دلوں کے قریب ہونے کا موقع اس سے بہتر کوئی نہیں۔۔۔۔۔!!

ضرورت ہے؟

”دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا“

عمر اور صحت نے ہم سے آنکھیں پُرانی شروع کیں۔ پُرانے ملازمین کچھ تو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ جو بچے وہ کام کاج کے قابل نہیں رہے۔ غرض کہ ہمارے گھر میں ملازمین کی قلتِ بانی سے بھی زیادہ ہو گئی۔ ہم نے ہر آنے جانے والے سے کہا کہ ہمیں ”خادمہ“ چاہیئے۔ یہاں تک کہ اخبار لانے والے، دھوبی، ترکاری والے اور اڈوں پرٹوس، سب ہی کا ہم نے جان کھانی شروع کر دی۔

ایک بار ہم کہیں جاتے ہوئے راستے میں رُک کر مٹھائی خرید رہے تھے تو ایک بھکارن ہمارے پاس آکر ”اللہ کے نام پہ“ کہتے ہوئے اپنا دستِ حقانی ہمارے آگے کر دیا۔ ہم نے اپنے ”دستِ عطا“ کو آگے بڑھانے سے پہلے اُسے غور سے دیکھا۔ معقول ناک نقشہ، قابلِ رشک صحت، اور اچھے خاصے کپڑوں میں وہ ہمیں بھکارن بالکل نہیں لگی۔ ہم نے پوچھا۔ ”ہمارے یہاں کام کرو گی۔؟“ اُس نے پوچھا۔ ”تنخواہ کیا ملے گی؟“

ہم نے کہا۔ ”جتنی بار چاہو کھانا کھاؤ، جو چاہو پہنو، تنخواہ چار سو روپے“ وہ کچھ سوچنے لگی، پھر کہا۔ ”پڑتلی نہیں پڑتی۔“ اور آگے بنا دھبک لئے بڑھ گئی۔!

ہم نے پھر ایک تدبیر کی، وہ یہ کہ اخبار میں اشتہار دے بیٹھے۔ "خادمِ مری ضرورت ہے" اور اپنا ٹیلی فون نمبر بھی دے دیا۔

فون پر فون آنے لگے، ہم آپریٹر کی طرح فی منٹ کے حساب سے فون ریسپ کرتے جا رہے تھے۔ مختلف سوالوں کے جواب ہمیں دینا پڑ رہا تھا۔ ہمارے سوال کرنے کی گنجائش ہی نہیں تھی، مثلاً ہم سے کہتے ہوئے سوالات ملاحظہ ہوں۔

کیا کام کرنا ہوگا؟ کتنے آدمیوں کا کام ہے؟ کتنا پیکوان کرنا ہے؟ تنخواہ کیا ملے گی؟ کھانا کتنی دفعہ؟ کھانے میں کیا کیا؟ پینے میں کیا کیا؟...
 سونے کے لئے جو روم دیا جائے گا اس میں "اسٹیج ہاتھ روم" ہے یا نہیں؟ گھر میں ریفریجریٹر ہے یا نہیں؟ ٹی وی ہے یا نہیں؟... وی سی آر ہے یا نہیں؟ کتنی فلمیں روز دکھائی جائیں گی؟ ہر ماہ کپڑوں کا ایک جوڑا بنے گا یا دو؟ پتائے کے لئے الگ دورہ ملے گا یا پینے کے دورہ میں ہی گنجائش نکالنا ہوگا؟
 نہانے کے لئے ویسی صابن یا غیر ملکی؟ شیمپو کونسا ملے گا؟ ہفتہ میں ایک دن گھونٹنے لیا جائے گا یا نہیں؟ عید کے موقع پر کارپوب کے کام کا جوڑا بنے گا یا
 تاشقند کا؟ طبیعت خراب ہو تو ڈاکٹر کو گھر پر بلائیں گے یا ہسپتال لے جائیں گے؟
 صاحب کتنی "پاکٹ مٹی" دیں گے؟ اور بیگ صاحبہ کتنی؟ ہندو دن میں ایک بار سینا لے جائیں گے یا پینے میں ایک بار؟ رات کے کھانے میں پڑنگ ہوگی یا صرف ملک شیک؟ صبح میں گھی کے پراٹھے ملیں گے یا مٹھن گھے ٹوسٹ؟ انڈیا ہاؤس ہو دیں گے یا آملیٹ؟ دوپہر میں شادی کباب دیں گے یا صرف کھا ہوا گوشت؟ رات کے کھانے میں چکن سوپ کے ساتھ سینڈویچ ملیں گے یا

شیرمال؟ ہر چوتھے دن مرغ پلاؤ ملے گا یا تلی ہوئی مچھلی؟ خواہش کے وقت
 پچائے دم کی ملے گی یا پکی ہوئی؟ یا ان کے تیرے کے ساتھ خوشبو کی گولی ملے گی
 یا نہیں؟ کپڑوں پر استری دھوین کرے گی یا لاندھری والے؟ سر میں لگانے
 کے لئے بھولوں کا گچھا ملے گا یا صرف ایک گلاب؟ بجلی کی بجھاڑو گھر میں ہے کہ
 نہیں؟ کپڑے دھونے کا آٹومٹک مشین ہے یا نہیں؟ ہندی لگانے کے لئے
 بیوٹی پارلر جانے کی سہولت ہوگی یا گھر پر ہی کوئی ہندی لگا دے گا۔۔۔۔۔؟
 ان سوالوں نے ہمیں آخر اس منزل پر پہنچا دیا جہاں ہم نے فیصلہ کیا کہ
 خادمہ کا نہ ہوتا ہی بہتر ہے۔ بڑی بے بسی سے ہم غالب کا یہ شعر دہراتے ہیں۔
 باز بچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے
 ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے



”دوستوں نے بھی کیا کمی کی ہے؟“

کسی شاعر نے کہا ہے ۷
دشمنوں نے تو دشمنی کی ہے
دوستوں نے بھی کیا کمی کی ہے

ہمیں اس شعر پر خیال آیا کہ کیوں نہ ہم بھی کچھ عرض حال کریں، کیونکہ ہمارے ”سر مبارک“ میں جتنی بھی عقل ہے وہ قطعی ہماری اپنی ہے، بالکل ذاتی ہے ہم اس معاملے میں بڑے خوددار واقع ہوئے ہیں، ذرا دیر کے لئے بھی کسی سے نہ عقل مانگتے ہیں نہ قرض کے طور پر اُدھار لیتے ہیں، ہمیں اس ”قارای عقل“ پر بڑا ناز ہے۔ ہاں! تو ہم بات کر رہے تھے دوستوں کی! ہوائیوں کہ ایک دفعہ ہماری پرانی سہیلی بہت عرصہ بعد ہمارے یہاں آئیں، ہم کو دیکھتے ہی دردناک چیخ ماری اور ہم سے بے ساختہ لیٹ کر مغوم لہجے میں کہنے لگیں ہائے، یہ تمہارا کیا حال ہو گیا ہے؟ سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہو، آنکھوں کے ارد گرد سیاہ حلقے، ہونٹ سوکھے ہوئے آخر کیا دکھ ہے تمہیں؟ کیا کوئی عارضہ لاحق ہو گیا ہے؟ ہم کسی بھی ”عارضہ“ کو ناحق بدنام کرنے کے حق میں نہیں تھے، ہم نے کہا۔ ”ایسا کچھ نہیں، بس کچھ دن سے کمزوری محسوس ہو رہی ہے۔ کام کی زیادتی سے کھانا ٹھیک طرح نہیں کھایا جاتا“

بہر حال ہماری دوست نے ہم کو بار بار تاکید کی اور قسم بھی دی کہ ہم اپنی صحت بنائیں، اپنا دھیان رکھیں، کھانا پیٹ بھر کھائیں، اچھی اچھی غذائیں پابندی سے لیا کریں، پھلوں کا استعمال تو کام کاج کے دوران بھی ہوتے رہنا چاہیئے، وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔۔ ہمیں اپنی دوست سے محبت اور بھی بڑھ گئی کہ بے چاری ہم کو کتنا چاہتی ہے اور ہم نے ان کے مشورہ پر عمل کرنا شروع کر دیا۔

کچھ عرصہ گزرا ہماری ایک اور دوست آئیں۔ ان صاحبہ نے ہم سے ملتے ہی کہا 'افو، باپ سے باپ! تم کتنی موٹی ہو گئی ہو! رنگ تو خیر پہلے بھی کم نہ تھا مگر اب موٹی بھی ہو گئی ہو، اتنا وزن کیوں بڑھ گیا؟ اس سے دل کا عارضہ ہو جائیگا' آج کل تو گوشت کا وزن بڑیاں بھی نہیں سنبھال سکتیں، اگر کبھی اتفاق سے کہیں گر پڑو گی تو اٹھ نہ سکو گی اور موٹے لوگ ہی قلب کے مریض ہوتے ہیں، کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہارے جسم میں پانی بھرنے لگا ہے؟ اب ہمارا بلڈ پریشر ان کے خوف ناک اندیشوں سے واقعی بڑھ گیا۔ ہمیں محسوس ہوا کہ ہم واقعی "گاما پہلون" کا ٹیکٹیو نہ سہی کاربن کاپی تو ہو ہی گئے ہیں۔ ویسے دل کو یہ اطمینان تھا کہ ہمارے جسم میں پانی نہیں بھر سکتا کیونکہ ہم کسی بھی طرح "وائر کولر" تو ہیں نہیں! مزید ان خاتون نے ہماری انگلیاں دیکھیں اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگیں۔ ہائے، ہائے کتنی نازک انگلیاں تھیں، اب تو دیکھو کیسی ہو گئی ہیں؟ کچھ دن بعد تم کوئی بھی حمیرا اپنے ہاتھ سے نہ پکڑ سکو گی۔ اُنہوں نے مزید پیش قیاسی کی، ہم گھبرا گئے، اللہ! نہ جانتے کیوں ہم ایسے ہو گئے، ہم نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی کہ یا اللہ! اب ہم کیا کریں؟ کوئی کہتا ہے حالت رہ گئی، کوئی کہتا ہے وزن

بڑھ گیا۔۔۔۔۔ "یا شافی تو کافی" اور اللہ میاں کو منانے کے لئے کئی منا جاتیں
 چم نے دل ہی دل میں پڑھ ڈالیں۔ آخر ہماری طبیعت ایک دن بگڑ ہی گئی۔ ڈاکٹر
 نے دیکھا اور کہا، کوئی خواص بات نہیں وزن بڑھنے سے اختلاج ہو رہا ہے
 غذائیں احتیاط کریں۔ ہم نے ڈاکٹر صاحب سے وعدہ کیا کہ ہم اب عمر بھر ایک نوالہ
 کھالابھی نہیں کھائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب بولے، جی نہیں، کھانا تو آپ کھانا ہے
 اور زندگی بھر کھانا ہے فقط نشاستے والی چیزیں، مرغی غذائیں نہ لیجئے، پراٹھوں
 کے بجائے چپاتی لیجئے وغیرہ وغیرہ، یعنی ہم جو پہلے تین دفعہ پھلوں کا رس، دودھ
 دودھ اور تین وقت "مغلانی کھاتے" کھارہے تھے وہ سب منع کر دیئے گئے
 "مغلانی ڈش" پر پابندی عائد کر دی گئی، اس کے بجائے ہمیں وٹامن کی گولیاں
 عنایت کی گئیں اور ہم میدان جنگ پر جانے والے سپاہی کی طرح علاج کے لئے تیار
 ہو گئے اور ڈاکٹر صاحب کے حسب ہدایت غذا، جھل قدمی، وٹامن کی
 گولیوں پر آ گئے۔ کچھ عرصہ بعد ہماری وہی پہلے والی سہیلی دوبارہ آئیں
 ہمیں دیکھا اور بولیں، ارے! تم تو بہت اسمارٹ لگ رہی ہو، کیا ہوگا
 کرنے لگی ہو؟ اپنی عمر سے کئی سال چھوٹی لگ رہی ہو، ذرا بتاؤ تو یہ انقلاب
 کیسے ہوا؟ ہم نے کہا تمہارے طفیل میں! انھوں نے پوچھا کیسے؟ ہم نے
 کہا نہ تم ہمارے ناتواں وجود پر پریشان ہوتیں نہ ہم محنت کر کے "گامایہلو" ^۱
 بننے کی کوشش کرتے نہ پھر ہمیں ڈاکٹروں کا "خیم" ^۲ ملتا نہ ہم عمل کر کے
 اسمارٹ بنتے، پھر ذرا دیر کے لئے دل میں اندامت کا احساس ہوا کہ ہم نے اپنی
 عقل کے بجائے دوسرے کی عقل استعمال کر لی تھی جس کا نتیجہ آپ دیکھ رہے

ہیں، ہے نا؟ بات یہیں ختم نہیں ہوتی " دوستوں کی دوستی " کا ذکر ابھی باقی ہے ویسے ہمیں اندازہ ہے کہ ابھی آپ بور نہیں ہوئے اور ہم اپنی بات اس وقت تک ختم نہیں کرتے جب تک کہ ہمیں احساس نہ ہو کہ آپ بور ہو چکے ہیں، ہاں تو ہم کہہ رہے تھے ایک اور صاحبہ جو ہماری دوست ہیں اُنھیں عورتوں کے بناؤ سنگھار سے بڑی دلچسپی ہے بلکہ دلچسپی ہی کیا وہ خود چلتا پھرتا "بیوٹی پارلر" میں ہم ایک دفعہ کسی شادی میں جانے کی تیاری میں "جی جان" سے لگے تھے وہ آگسٹیں اور انھوں نے ہمارا حلیہ دیکھ کر کہا، تم کیا اس حالت میں شادی میں شریک ہو گی؟ ہم نے پوچھا، کیوں کیا ہمارا حال بُرا لگتا ہے؟ اُنھوں نے قہقہہ لگایا اور ہمیں اپنے دونوں ہاتھوں میں دبوچ لیا اور اس کے بعد بہت ساری چیزیں اپنے برس میں سے نکالیں اور ہمارے چہرے کی کافی مرمت کر ڈالی اس کے بعد ہمارے بکھرے گیسو ان کی مضبوط گرفت میں آ گئے اور ہم آہ کئے بنا ان کے آگے ٹھکے رہے کچھ دیر بعد اُنھوں نے آئینہ ہمارے سامنے کر دیا، ہائے کیا بتائیں؟ بخدا یہ ہمارا عکس نہیں تھا، ہرگز نہیں تھا۔ ہم اس طرح کے کبھی نہیں تھے، کہاں سیدھے سادے چہرے کی اصلیت اور کہاں یہ آنکھوں کے اطراف نیلے حاشیے، رخساروں پر بے وقت کی شفق، اور ہونٹوں پر بے موسم گلاب کی سُرخ کلیاں، سر پر بالوں کا اُلٹا ہوا سا پیالہ، آہ یہ ہم آتو نہ تھے، ہم ہرگز نہ تھے، آئینہ تو ہمیں اپنی پہچان دینے کے لئے ہوتا ہے، لینے کے لئے نہیں، ہم نے شادی میں جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا مگر گھر والوں نے ہمیں مجبور

کہو یا کہ رشتہ داری کا معاملہ ہے جانا ضروری ہے خیر کسی طرح ہم شادی
 میں پہنچے ہم شرم سے جھکے جھکے شادی میں شریک رہے کئی خواتین نے
 ہمارے اس انداز کو سراہا، اور بڑی بوڑھیوں نے تنقیدی نگاہوں سے گھورتا
 شروع کیا اب ہم حواس کھونے لگے تھے، کچھ خواتین جو ہماری بے تکلف
 دوست تھیں ہمارے گرد ہال بنا کر بیٹھ گئیں ہم پشیمان، سب سے نظریں
 ہمارے پیٹھے رہے جیسے کہ ہم نے کوئی عجیب کام کیا ہو، خدا خدا کر کے واپسی کا وقت
 ہوا ہم حواس باختہ سیڑھیوں سے اترتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑے کیونکہ ہماری
 ریوٹیشن دوست "نے ہماری ساڑی بھی کچھ اس طرح باندھی تھی کہ چلنا دو بھر
 ہو گیا خیر تو ہم جیسے ہی گرے ہمارے بال جو اونچے اسٹائل میں بندھے تھے کھل
 کے بکھر گئے۔ ہم بے انتہا پشیمانی کے عالم میں گھر پہنچے اور سیدھے آئینے کے سامنے
 جا کر کھڑے ہو گئے۔ چہرہ رنگین، بکھرے بال، وحشت زدہ سے ہم کھڑے
 سوچنے لگے۔

دوستوں نے بھی کیا کمی ہے.....!

ہم اور آئینہ

شکستہ آئینہ، نگاہ آئینہ ساز میں عزیز ہوتا ہے لیکن ہم غیر شکستہ آئینہ کو باکمال سمجھتے ہیں کیونکہ جب تک ہم اپنا پورا چہرہ نہ دیکھیں بھلا خود کو پہچان کیسے سکتے ہیں؟ اگر ٹوٹے ہوئے چہرے پر بے ترتیب کئی بال پریشان نظر آئیں گے اور ہم "اصلاح معاشرہ" کی طرح خود کو سنوارنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے احمق ہی لگیں گا۔ "آئینہ" دل تو ہوتا نہیں جو ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بھی کام آتا رہے۔۔۔۔۔

پھر سمجھو تدبیر نے کیوں ہمیں ٹوٹا ہوا آئینہ پھینکنے کو جی نہیں چاہتا۔ ہمیں نیچر کا وہ حادثہ یاد آ جاتا ہے جس سے ہم بڑے کروفر کے ساتھ گزرے تھے۔

گھر کا صحن بہت ہی بڑا تھا۔ دائیں طرف ایک گوشے میں باغیانی کے شوقی کا منظر تھے وہ پودے جو ہمیں دیکھ دیکھ کر جھومتے رہتے تھے۔ ہم نے ایک کونے میں تنکائی لگنے والی اینٹوں کا ڈھیر اور لال مٹی والوں ہی ڈال رکھی تھی۔ یہ ڈھیر کافی اونچا ہو گیا تھا۔۔۔۔۔ ہمارے قد کی طرح۔۔۔۔۔! وہیں دیوار کے اوپر ایک دفہ بہت ہی خوبصورت بڑی سی پتنگ آکر الگ گئی۔ باہر سے مسلسل کوئی ڈور کھینچ رہا تھا۔ بھلا اس پتنگ کی بساط کیا تھا۔ ہم نے بقول غالب "اٹھ کے قدم پا بسباں کے لئے" نہ جتنا سنگ چیمین کی طرح اپک کر اس پتنگ کو تھام لیا، ڈور سے پتنگ الگ ہو گئی اور اسی لمحہ ہمیں احساس ہوا کہ ہمارے پاؤں کے نیچے کوئی انگارہ آگیا ہے ہم نے

'ہنس' ٹیلے سے اتر کر یتنگ کو گلے لگا لیا، ہلکے پیاز کی رنگ کی یتنگ پر سیاہ بارڈر کے ساتھ دو سرخ دائرے بڑے دلکش لگ رہے تھے۔ ہم کسی طرح وہیں مٹی کے ڈھیر پر بیٹھ گئے۔ یتنگ دوسری طرف رکھی اور اپنے تلووں کو الٹ کر دیکھا، جہاں بڑا سا تگونی آئینہ کا ٹکڑا ہمارے تلوے میں "جائے پناہ" ڈھونڈتے ہوئے اس قدر اندر جا چکا تھا کہ ہمیں اس کا کچھ حصہ جو باہر تھا پکڑ کر کھینچنے میں مشکل ہو رہی تھی، خوبصورت یتنگ کے حصول کے بعد درد کا احساس ہوا مگر اس واقعے تک آئینہ کا تین تا چار اینچ کا ٹکڑا ہمارے تلوے میں بوری طرح دھنس گیا تھا۔ خیر کسی طرح ہم نے ہمت کر کے وہ آئینہ کا ٹکڑا کھینچ نکالا۔۔۔۔۔ ایک آہ بھی ہمارے منہ سے نکل گئی۔۔۔۔۔

اور اس کے بعد خون کی موٹی سی دھار ہمارے تلوے سے بہہ نکلی۔ ہم منہ بڑے غور سے دیکھ رہے تھے زمین پر موٹی سی سرخ دھار بڑھتی جا رہی تھی اور صحن کے اونچے حصے سے ہوتے ہوئے وہ نیچے آگئی۔ ہم بدستور کبھی "لہو کا رنگ" دیکھتے تو کبھی یتنگ دیکھتے، ہمیں خادمہ کی چیخ سنائی دی۔۔۔۔۔ و۔۔۔۔۔ و۔۔۔۔۔ اور گھر والے ہماری طرف دوڑ پڑے۔ ہمیں وہیں "فرش خاک" پر لٹا دیا گیا، پاؤں کے نیچے ٹیکہ رکھ کر پاؤں اونچا کیا اور مختلف گھریلو نسخے خون روکنے کے لئے آزمائے جانے لگے، کسی خادمہ کے منہ سے نکلا "اے ہے، خون بہہ جاتے سے چہرہ سفید پڑ چکا ہے" ہم نے ضد شروع کی کہ ہم اپنا "سفید چہرہ" دیکھیں گے، آئینہ لاؤ، ہمیں خون پہننے سے زیادہ سفید چہرے کی فکر پڑ گئی، آخر کافی ٹکراتے بعد ہمارے سامنے "بیجم" کا آئینہ لایا گیا، لیکن ہمیں خادمہ کے جھوٹ پر بہت غصہ آیا۔ ہمارا چہرہ سفید پر گز نہیں تھا، ہمارے گلابی چہرے پر درد کا سرخ رنگ نکھڑ آیا تھا۔۔۔۔۔

پاؤں سے کھینچ کر نکالے ہوئے آئینے کے ٹکڑے کو ہم نے طلب کیا اور اس میں اپنا
 چہرہ دیکھا تو عجیب سا لگا۔ شیشے کو پارہ سے آراستہ کیا جائے تو آئینہ ہو جاتا ہے
 ورنہ صرف شیشہ ہی رہتا ہے۔ اس شیشے کے اس پار ہمیں اپنے ”پیارے سارے“ نظر
 آرہے تھے جو ہمارے پاؤں کی مرہم بیٹی میں لگے تھے۔ اس شیشے کو دیکھتے ہی ہمارا
 پارہ چڑھ گیا اور اسے اتنی نور سے زمین پر دے مارا کہ پارہ پارہ ہو گیا۔ . . .
 ہمیں اپنے بازو رکھی ہوئی پتنگ یاد آئی جسے ہم نے جانباز سپاہی کی طرح غولہ مار
 حاصل کیا تھا۔

ہم نے پھر بڑا سا آئینہ دیکھا، اب چہرے پر درد کا رنگ گھل نہیں تھا بلکہ پتنگ
 کی خوشی شفق بن کر دمک رہی تھی۔

ہم کو اپنے زخم کی جلن کم ہوتی محسوس ہونے لگی، پھر پتنگ پر بیٹے گول
 دائرے دیکھتے ہوئے ہم بھی گول ہو گئے۔ یعنی کہ بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش آیا تو
 پاؤں پر پتلی بندھی ہوئی تھی، گھر والے قریب بیٹھے تھے، جس ہوش میں آتا دیکھ کر
 خوش ہو گئے۔ ہمیں پھر پتنگ یاد آئی، جب ہم نے پوچھا تو ہمیں ہنر دست ڈانٹ
 پڑی کہ ہم مرتے مرتے بچے ہیں، ایک پتنگ کے لئے آج آئینہ ہمیں ملات دے گیا تھا۔

”موسموں کا مزاج“

ہمیں موسموں کا مزاج بالکل بدلا ہوا سا لگنے لگا ہے
 غلط فہمی کا شکار ہم ہرگز نہیں ہیں، بلکہ ”بہمی“ کا شکار کرتے کرتے ہماری عمر
 گزر جانے پر تلی ہے، ہم آپ کو موسم کے بدلتے مزاج ”کا ثبوت دیں گے تب تو
 آپ کو یقین آئے گا نا !

ایک دفعہ ہم اپنے کمرے میں بیٹھے کچھ ”کھاپڑھی“ کر رہے تھے، کھرکی
 سے باہر نظر دوڑائی تو نظارہ کافی دلکش تھا۔ آبرآلود آسمان سے مسخنی سی
 بوندیں زمین پر ”جھم جھم“ گر رہی تھیں۔ بالکل اسی طرح جیسے دو چار ماہ کا
 بچہ سوئی ہوئی ماں پر گرتے اور اُٹھتے رہنے کا کھیل کھیلتا ہے۔ ماں جاگی
 ہوئی رہنے کے باوجود بھی سوئی سی رہتی ہے۔ ہماری یہ زمین بھی تو ماں ہی۔ ہے
 نا ! اس لئے وہ اس مسخنی مٹی بوندوں کی اُچھل کود سے مسرور رہتی ہے، ہمیں
 ایسے منظر بہت اچھے لگتے ہیں اور ہمارا موڈ بالکل شاعرانہ ہو جاتا ہے اور ہم اپنے قلم
 کو ”شستر بے مہار“ کی طرح اپنے ہاتھوں میں دے کر بیٹھ جاتے ہیں
 ہاں تو ہم نے اس دفعہ بھی ایسے ہی کیا مگر صفات پر سیاہی پھیلتی نظر آئی۔
 ارے، یہ کیا ؟ یہ مسخنی سی بوندیں ہمارے صفات پر کیسے گر نہ لگیں ؟ ہم
 نے سر اٹھا کر اُس چھت کی طرف دیکھا جس کے نیچے ہم بے تکلف بیٹھے ہوئے تھے

چھت تو بالکل ٹیک ٹھاک تھی تو پھر یہ قطرے کہاں سے ٹپک رہے تھے۔ کہیں ہماری آنکھیں شاعری میں بہاؤے جانے والے اشکِ غم سے لبریز تو نہیں ہو گئیں؟ ہم نے ماہر سی آئی ڈی آفیسر کی طرح پتھان بین شروع کی۔ ہم نے آخر وہیں بیٹھے بیٹھے ان بوندوں کا سراغ پائی لیا، یہ بوندیں بارش کی بوندیں تھیں اور نہ ہی "دیدہ تر" کی بوندیں تھیں بلکہ یہ ہماری "جبینِ عرقِ اکودہ" کا کارنامہ تھا، ہم پریشان ہو گئے کہ اس ٹھنڈے اور کیلے موسم میں ہم اتنے پسینے میں شرابور کیسے ہو گئے؟ ہم نے پھر اُس خوبصورت نظارے کو دیکھنے کے لئے باہر نظر دوڑائی تو وہاں اب تو موسلا دھار بارش شروع ہو چکی تھی۔ پانی کی بڑی بڑی سلسلہ وار بوندوں نے مسخنی سی بوندوں کو صفحہ منظر سے مٹا ڈالا تھا۔ تیز بارش، ہوا کے دباؤ میں کمی یہی وجہ تھی جو ہم پسینہ میں نہا گئے تھے۔

ایک دفعہ ایک اور عجیب واقعہ ہوا۔ گرمی کا نور تھا، سورج پورے جاہ و جلال کے ساتھ جلوہ گر تھا، کسی کم بخت کی محال نہ تھی کہ نظر اٹھا سکے۔ ہم نے کوئی دوپہر میں اپنا "سوٹر" تلاش کر کے پہن لیا، اوپر سے گرم شال بھی اوڑھ لی۔ ہمارے سر تاج نے ہمیں شک کی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا یہ کیا پاگل پن ہے؟ ہم نے دانت بجاتے ہوئے یہ مشکل جواب دیا کہ سردی ہو رہی ہے۔ سردی ہو رہی ہے؟ وہ حیران رہ گئے، پھر کہا پاگل پن کے بارے میں سنا تو تھا، آج دیکھ بھی لیا، چلچلاتی دھوپ میں یہ گرم کپڑے سبحان اللہ..... ہم نے اپنے برف کی طرح ٹھنڈے ہاتھوں سے اُن کے ہاتھ پھوٹے ہوئے کہا، بخدا ہم بھوٹ نہیں کہہ رہے ہیں، دیکھئے ہماری حالت!

انہوں نے پوچھا، کیا تم نے آئس کریم زیادہ کھالی تھی؟ ہم آئس کریم کا نام
سُننے ہی اور بھی کاپسنے لگے اور گھڑی کی طرح بلا ٹکٹ اوڑھ کر سو گئے۔ سب پر
تک ہم ”نارمل“ ہو چکے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ملیشیا کا آئیٹک تھا۔

ایک اتفاق ایسا بھی ہوا کہ جب موسم سرما نے کُھر کی چادر میں سارے شہر
کو پیسٹ لیا تھا تو ہم آدھی رات کو بے قرار ہو کر اُٹھے اور پنکھا کھول دیا۔ ہم
وحشت زدہ ہو کر پسینہ بونچھنے لگے تھے مگر خدا جانے کیا ہو گیا تھا کہ پسینہ
نکلتا ہی جا رہا تھا، بال بھیگ گئے، کپڑے بھیگ گئے، یہاں تک کہ ہم جس
تکیہ پر لیٹے تھے وہ بھی گیلا ہو گیا، پنکھے کو کھلا دیکھ کر ہمارے سرتاج نے
ہمیں ڈانٹا، یہ کیا ہے؟ بند کرو پنکھا، کیا مرنے کا ارادہ ہے؟ ہم نے باپیتے
ہوئے کہا، ارے ہوا زندگی کی پہلی ضرورت ہے اور ہم زندہ رہنے کے لئے ہی تو
ہوالے رہے ہیں، یہ دیکھئے! وہ پریشان ہو کر بولے کیا نہما کر نکلی ہو؟ ہم
نے انکار میں سر ہلایا تو انہوں نے پوچھا، طبیعت کیسی ہے؟ ہم نے اپنے آپ کو
آگے کرتے ہوئے کہا، دیکھئے! بس ایسی ہے، باتوں کی وجہ ذہن اپنی طرف
سے ہٹا تو پسینہ رکنے لگا، رفتہ رفتہ ہم پھر اصلی حالت میں آ گئے۔
بعد میں پتہ چلا کہ برسوں بعد جو ہمیں بخار آیا تھا اُس کم بخت نے اس سردی
میں آدھی رات کو اترنے کی منت مانی تھی، اب آپ ہی بتائیے، ان حالات
میں اگر ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ”موسموں کا مزاج“ بدل گیا ہے تو کیا یہ
غلط ہے؟ کہیئے نا ؟؟؟

”ایک شام ہماری بھی“

ہوا کچھ ایسا کہ ایک شعری مجموعہ ہم سے سرنو ہو گیا۔ بس! پھر کیا تھا؟
 ”مغفل خواتین“ نے مارے خوشی کے ایک ”تقریبِ اجراء“ منادالی اور وہ بھی کچھ
 اس طرح کہ ہم بوکھلے سے گئے۔ بڑی بڑی نامور ادیب و خواتین و شعراء کو بلایا گیا
 کہ وہ ہم پر ہمارے کلام پر روشنی ڈالیں (یہ اور بات ہے کہ ہم پر زیادہ روشنی کبیرہ
 مین اور ویڈیو گرافر ڈال رہے تھے) اس عمل کی کنوینر تھیں ڈاکٹر صابرہ سعید پہلے مگھوشی
 طے پائی۔ تمام جہانوں کو پھولوں کے ہار پہنتے گئے۔ پھر ناچنے کے گلے میں بھی کئی ہار ڈالے
 گئے جن میں دو ستوں کے ہار بھی شامل تھے۔ وہ تو کہنے کے بغیر ہوئی، ورنہ ہم کسی کمزور سے
 گلدان کی طرح گر پڑے ہوتے۔ پھر پھولوں کا سلسلہ ختم ہوا تو مجموعہ کلام ”اب کے برس“
 کے چہرے سے نقاب ہٹائی گئی۔ بخدا دنیا میں سب سے زیادہ یہی کتاب ہم کو اچھی لگی۔ یہ
 ہماری اپنی کتاب تھی جسے ہم بڑی عقیدت سے دیکھ رہے تھے کیونکہ یہ کتاب ہمارا نیا جنم
 تھا۔ ہم نے بڑی بڑی سانسیں لیں اور ضبط کے خوگر بنے بیٹھے رہے ورنہ جی چاہ رہا تھا کہ
 آدابِ مغفل بالائے طاق رکھ کر ہم وہ زور دار قالیاں بجائیں جو دلی خوشی سے اظہارِ غلطی
 کرتی ہیں۔

ہم سب ہی کے منہ سے پھول جھڑتے دیکھتے رہے۔ کبھی کبھی ہم پر تارے بھی
 ٹوٹے بغیر گرتے رہے اور ہم آجاولوں میں بھیگتے رہے۔ ہم اپنے آپ کو بے حد شرمندہ محسوس

کر رہے تھے کیونکہ حاضرین محفل کی نظریں ہم پر لگی تھیں اور عقربین نے ہم سے کافی امیدیں وابستہ کرتے ہوئے ہمارے نام کے پرچم اپنے لفظوں کے پیرہن میں لہرا دیئے تھے۔

مجم بخت کمرے کی آنکھ ہم سے مسلسل آنکھیں لڑا رہی تھی۔ ہم اپنے دائیں بائیں بیٹھی معزز ہستیوں کو چور نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ایسی شخصیتوں کے ساتھ بیٹھا کوئی معمولی بات نہیں جن کے نام کے ڈنکے بجتے رہتے ہیں۔ اس طرح کی ادبی محفلوں میں ہم وجود سے "حاضر" ہوتے ہوئے بھی ذات سے اکثر غائب ہو جاتے ہیں اور اس وقت بھی ایسا ہی تھا۔ ہمارے اندر کا موسم بدلتا ہی جا رہا تھا۔ کبھی احساس کمتری کی سرد لہر ہم میں دوڑ جاتی تو کبھی محبت بھرے جلے شبنم کی حیات کی گرم لہر ہمارے وجود کے اندر بگولوں کی طرح اٹھ بٹکتی۔

غرض کہ اس یادگار شام کو ہم کبھی نہ بھلا پائیں گے۔ بیگم ہاشم علی اختر۔ بیگم انیس حسن الدین صاحبہ، محترمہ سلطانہ شرف الدین، محترمہ فاطمہ عالم علی خاں، محترمہ نایاب سلطانہ، پدم شری محترمہ شریف النساء، محترمہ آمنہ حیدر خاں، محترمہ قادری بیگم، محترمہ پروفیسر رفیعہ سلطانہ صاحبہ، محترمہ آرمہ بانو صاحبہ، ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید صاحبہ، محترمہ اقبال جہاں قدیر، مظفر النساء ناز، شرجیلی، عالیہ خان، رحیمہ سلطان شاہین بیگم نواب اقبال علی خاں جیسی شخصیتوں کے علاوہ کئی اور خواہشیں بھی موجود تھیں۔ جلسے کے اختتام پر کچھ اجنبی خواتین جانے لگیں۔ کچھ ہمیں مبارکباد دینے لگیں۔ کسی نے ہمیں گلے لگایا، کسی نے دعا دی، کسی نے ہاتھ لایا۔ بہر حال ہم "صاحب کتاب" تسلیم کر لئے گئے۔ ہم اللہ ام میں بوکھلائے ہوئے تھے مگر محفل جب رنگ پر آگئی تو دل ہی دل میں اپنے آپ کو شاباشی دی کہ واقعی ہم نے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ ہم اپنے اس پہلے تجربے کی کامیابی پر اتنے خوش تھے جیسے کہ پہلی بار ایٹم بم ناکرہا ہل مغرب سرور ہوئے تھے، یاد ہے نا؟

”موسم گرما اور ہم“

آسمان کی گزشتہ جگہ سے آج کی صورت پر اتنی کڑور ہو گئی ہے کہ سورج آسمان کی ہتھیلی میں چپکنے کے بجائے ہمارے سروں پر آگیا ہے۔ ہر چند کہ ”سوائیزے“ پر نہیں لیکن ہمیں تو لگتا ہے کہ ہمارے سر پر ہی آج کی طلوع آفتاب ہو رہا ہے۔ ہم اکثر شہر کے بھرے پڑے علاقے سے گزرتے رہتے ہیں۔ ہمیں اپنے شہر کی پکٹی سڑکیں فولادی لگتی ہیں۔ ان کی تپش آنے جانے والے راگیروں کے چہروں سے عیاں ہوتی رہتی ہے۔ سڑک کے ہر طرف خوش رنگ شربتوں کے گلاس اور خوش شکل تراشے ہوئے پھل خواہ مخواہ لگا ہوں ہیں ”زیدہ پن“ پیدا کرتے ہیں۔ کہیں کسی کے ہاتھ میں آنسکریم نظر آتی ہے تو ہماری بھی دال ٹپک پڑتی ہے۔ مگر ہم کیا کریں کہ ہمیں سڑکوں پر نہ کھانے کی عادت ہے نہ ٹھہرنے کی۔ یہ سب تو ہم آتے جاتے دیکھتے رہتے ہیں۔ آسمان کا ستم ڈھانایوں بھی شاعروں کے لئے نیا نہیں۔ آسمان ”دو آتشہ“ ہو جاتا ہے تو بے چاری ہوائیں بھی اپنی ٹھنڈک اس آسمان کے سائے میں گھو بیٹھتی ہیں۔ گرم لٹو کے جھکڑ والے لبادے پہنی یہ ہوائیں اپنی خوش خرامی بھول کر ”بگولہ“ بن جاتی ہیں۔

ہم نے کئی بار چاہا کہ تپتی دھوپ میں شہنشاہِ فلک کو اک نظر دیکھ لیں۔ وہ کیوں چلنے لگا ہے؟ آخر ہم اہلِ زمیں سے ایسی کیا خطا سرزد ہوئی کہ اُس کا

غصہ کم نہیں ہوتا۔ لیکن ہم نے جب بھی آنکھ اٹھا کر آفتاب کو دیکھنے کی کوشش کی، لگا کہ ہماری آنکھوں میں گرم گرم ٹاوا گرنے لگا ہے۔ ہم نے سیاہ چشمہ آنکھوں پر چڑھا لیا اور لگے شیشے کی دیوار کے پیچھے سے نظارہ کرنے، لیکن نقشہ بدل چکا تھا۔ دھوپ کے منظر چھاؤں دینے لگے۔ ہم نے شوخی میں آکریوں ہی ننگے پاؤں چلنے کی کوشش کی۔۔۔۔۔ اُف! شائد ہم پاگل ہو گئے تھے۔ بھلا "انگاریوں" پر کہیں ہم جیسے لوگ چل سکتے ہیں بھلا۔۔۔۔۔ آگ کے دریا ہم جسوں سے قطعی یار نہیں ہو سکتے، بالکل نہیں۔۔۔۔۔!

ہم نے موسم گرما میں ہر سڑک پر چلنے والے کو دیکھا ہے کسی کے چہرے پر وہ آثار پائے نہیں جاتے جو اسے انسان ثابت کر سکے۔ بس! اک عالم وحشت چہروں پر طاری ہے۔ ہر شخص دھوپ سے بچتا چاہتا ہے۔ ہر شخص جلد سے جلد دھکتے ماحول سے گزر جانا چاہتا ہے۔ پتہ نہیں کیوں ہمیں ایسی خواہش ہوتی ہے کہ اس دھوپ سے بچنے کے لئے اگر ایک آدمی دوسرے آدمی کی چھاؤں میں چلنے لگے تو۔۔۔۔۔ گرمی کا احساس بھی کم ہو گا اور اپنے ہمسفر کی شرافت بھی ہو جائے گی، مگر لوگ یہ بات نہیں سمجھتے۔ ایک دوسرے کو دھکیلے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ پگھلتے ہوئے انسانوں کا دل خدا جانے کیوں نہیں پگھلتا؟۔ وہ رک کر، ذرا دیر ٹھہر کر پیاس کے کنارے دو گھونٹ "اخلاق" پنی کر کیوں نہیں چلتے؟ انھیں شہنشاہ فلک کے دربار میں پگھلنا تو آتا ہے مگر پگھلنے کے بعد بھی محبت کا سرچشمہ نہیں ہو پاتے، خدا جانے کیوں؟۔۔۔۔۔ نہ جاتے کیوں؟

ہمارا خیال ہے کہ موسم کی تمازت پہنے کے لئے نہیں بلکہ ایک دوسرے کی ضرورت کو سمجھنے کی ہمت چاہیے۔ اُن لوگوں کو بھی چھاؤں کی ضرورت ہے جو جلد چل نہیں سکتے۔ آگ کے دریا سے گذر نہیں سکتے۔ ٹھہر جانے کے باوجود کوئی ان کی پیاس نہیں بکھاتا۔ آسمان بھی نہیں۔

افوہ! ہم اس غور و فکر کے سمندر میں غوطے کھا ہی رہے تھے کہ ہمیں احساس ہوا کہ ہمارے سر پر ”طلوع آفتاب“ ہو رہا ہے، نہ صرف یہ بلکہ آگ کا ٹھٹھ مارتا سمندر بھی ہماری قدم بوسی کر رہا ہے، ہم بے چین ہو گئے۔ بات یہ تھی کہ ہم اپنے خیالوں میں رہے۔ ہمارا آٹو والا آٹورکٹ کھڑی دھوپ میں ٹھہر کر شربت پیتے اُس پار چلا گیا۔ آٹو کی چھت دھک رہی تھی، آٹو کا فرسٹ سنگ رہا تھا۔ ہمیں یاد آیا کہ ابھی کچھ دن پہلے کیسا ٹھنڈا موسم تھا، ہمارے ہاتھ پاؤں برف کی مانند رہتے تھے۔ ہم سوئٹزر کے علاوہ گرم شال اپنے شانول پر ڈالے دانت بجاتے پھرتے تھے۔

ہم موسم سرما میں کافی ”کم گو“ ہو جاتے ہیں۔ بات کرنے کیلئے منہ کھولنا بڑتا ہے اور منہ کھلتے ہی قضا کی سردی ہمارے لہجے کو سرد کر دیتی ہے جس سے ہمارے ”گھریلو معاملات“ کئی بار ”بگڑتے اور بنتے“ رہتے ہیں۔ گرم کپڑے اور گرمیوں کے مٹے کے مزے لیتے ہوئے ہم کڑا کے کی سردی میں گرمیوں کے طلب گار ہوتے ہیں اور جب موسم گرم آتا ہے تو ہم گھبرا جاتے ہیں۔ ضرورت سے بھی زیادہ۔ !!



ہم نے بھی عید منائی

آپ چاہے عید کسی طرح منائیں لیکن ہم نے عید کس طرح منائی ذرا
یہ تو سُنے.....

بادام، کشمش، کاجو، چروغی، پستے اور کھجور کے اونچے اونچے پہاڑوں
کے درمیاں سیویوں کے ڈھیر پر بیٹھے ہم ~~دھڑکے~~ تالاب میں مہسری کی ڈلیاں
روں ہی پھینکتے جا رہے تھے۔ ہمیں خیال ہوا کہ ”ذرا دُور اُس موڑ پر“ ایک اور
تالاب سا نظر آ رہا ہے، ہم وہاں پہنچے تو بس روح جھوم ہی تو گئی۔ یہاں ایک
نہیں، کئی تالاب تھے، خوشبو سے بھرے ان چشموں میں وہی پھول ہمیں نظر
آئے جن سے یہ چشتے بھرے تھے، کہیں گلاب کا چشتم، کہیں موتیا کا چشتم،
کہیں خس اور کہیں رات کی رانی ہائے! ہم نے تو سوچا بھی نہیں تھا
کہ ہمارا مقدر اس طرح چمکے گا، ہم تو چھپاک، چھپاک ایک ایک چشتے میں
ہاتھ مارتے جا رہے تھے، مارے خوشی کے ہم یہ بھول ہما گئے کہ ہمیں
عید منانی ہے یعنی سب سے پہلے جو عید کا دستور ہے ”سے کپڑے“ ہم نے
اپنے کپڑوں کی طرف دھیان ہی نہیں دیا لیکن اتنا ضرور یاد تھا کہ درزی اگر
مانک بہ کرم ہو تو خوشی کی بات ہے۔ اگر کپڑے نہ ملے ہوں تو ہم کیسا
کر سکتے ہیں بس، یہی کہ عید نہ منا سکیں گے ”بالا عید کو ہماری ہنسی اڑانے

دیجئے بھلا ہم کر ہی گیل سکتے ہیں، خیر، پھر ہم اُس مغزیات کی وادی میں دوبارہ پہنچ گئے جہاں لذتِ کام و دہن کے گلستاں ہی گلستاں تھے۔ ہم نے سوچا کہ سیویوں کے ڈھیر سے ذرا اور آگے دیکھیں شاید کچھ اور حسین نکلا رہا ہو، نوگی تو ستاروں سے آگے بھی چلے جاتے ہیں نا؟ ہم آگے بڑھے، واقعی ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے وہ نظارہ ہماری آنکھوں کے سامنے تھا۔ چھوٹے چھوٹے اصلی گھی کے حوض جن کے فواروں سے گرم گرم اور تازہ خوشبودار گھی اُبل رہا تھا۔ کچھ زردی مائل حوض بھی تھے جن میں زعفرانی شیرہ بھرا ہوا تھا، ہائے، ہم کیا کریں؟ ہم بڑے نزدیک ہو چلے تھے، ہم مغزیات کی اس وادی میں کیسے آئے یہ تو خبر نہیں لیکن اب یہ جگہ چھوڑ کر جانے کے لئے ہم ہرگز تیار نہ تھے۔ دفعتاً ہماری نظر اُس عجیب وضع کے چھوٹے سے ٹیلے پر پڑی جو بے حد بہتر تھا، ہم قریب پہنچے تو اُف، کیا بیان کریں، واہ واہ، پان کی خوشبودار گلیوں سے بنا ہوا یہ ننھا سا پہاڑ ہم پر مسکرا رہا تھا، عطر کے چشموں میں پھپھا کے مارنے کے بعد ہمارا دھودھی بہکتے لگا تھا، ذہن و قلب میں شیریں، تخیلات کی یلغار تھی اور عقل و دور کی شہزادیوں کے نقش قدم پر چلنے کی ترغیب دینے والا یہ پان کی گلیوں کا پہاڑ ہمیں اپنے پاس بٹا رہا تھا۔ ہائے قربان، خدا جانے یہ سب ہماری کسی نیکی کا انعام تھا، ہم مگن ہو گئے۔ ذرا بہکتے گئے، پھر ایک جست لگائی عطر کے چشموں کی طرف۔

خادمہ کی چیخ سُنائی دی اور ہم آگئے ہوش میں، عید کی تیاری میں

معروف ہم شیر خرم بنانے سے پہلے بڑی سی بالٹی کا دودھ بڑے دیگچہ میں
ڈالتے ہوئے عالم تصور میں کھو گئے تھے۔ جب ہمارے تصور نے ہمیں عطر کے
چشمے میں دھکا دیا تو ہم سچ پچ دودھ کے بڑے دیگچے میں چھپاک، چھپاک
ہاتھ مارنے لگے تھے، دودھ اُچھل رہا تھا اور ہم دودھ کی بارش میں بھیگ رہے
تھے۔ ہمارے نئے کپڑے لگتا تھا کہ کسی قدیم میوزیم سے لائے گئے ہوں جو اُس
زمانے کے دربار میں کسی فقیر کو بھیک میں دیئے گئے تھے، عید کے مبارک موقع پر
..... اور شاہد اس دودھ کے سلطان نے اُسے اپنی پوشاک بخشش
دے کر اُس کے لباس کو بطور یادگار اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا، حالانکہ
یہ ہمارا عید کا بالکل نیا اور شاہد لباس تھا جسے ہم نے اپنی "خیالی پیر"
سے برباد کر لیا تھا۔ عطر کے چشموں کا خیال آنے کے بعد ہوش تیرہوں
ہی جاتے رہتے ہیں نا ؟

”لب ڈب“

لب ڈب ! لب ڈب ! لب ڈب !

چشمہ نہیں ! ہم بھواس بالکل بے نہیں کر رہے ہیں ہم تو آپ کو معمول کے مطابق دلی کی آواز سن رہے ہیں جو ہمارے بھاری بھر کم وجود کے اندر گونج رہی ہے بالکل جس کی طرح، اور کاروانِ حیات رواں دواں ہے۔۔۔۔۔ ہم اس کاروان کو روک نہیں سکتے، ہم خود اس کے ساتھ چلتے ہیں، ہمارے قدموں کی آہٹ بھی لب ڈب، لب ڈب کی نئے سے میل کھاتی ہے اتفاقاً کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ قدموں کی لڑکھڑاہٹ دل میں لب ڈب کی آواز گوندا ہے منگ کر دیتی ہے، تاری حیات جھنجھٹا ٹھٹھا ہے اور ہم اپنے اندر ارتعاش محسوس کرتے ہیں۔ رفتہ رفتہ ہم معمول کے مطابق ہو جاتے ہیں لیکن اُس وقت صدائے لب ڈب“ پھر بے ترتیب ہو جاتی ہے جب ہم مشاعروں کے بارے میں بحث کرتے اور سنتے ہیں۔ اس دورِ حاضر نے غیر شاعرانہ ماحول میں بھی مشاعرے منظم کرتے دی ٹھان رکھی ہے۔ پندرہ تا بیس افراد کی تعداد میں بھی مشاعرے ہونے لگے ہیں جن میں سے آدھے شاعر اور آدھے سامعین ہوتے ہیں، بڑے بڑے مشاعروں کی بات اور بے مگر وہاں بھی اب بلاتوق کم اور بد ذوق زیادہ پائے جاتے ہیں۔ ہم ایک مرتبہ کسی مشاعرہ میں شریک تھے، سامعین کو اصرار

تھا کہ اُس شاعرہ کو دوبارہ پڑھایا جائے جو محفل گرما گئی تھی، انتظامیہ کے لوگ اس کے حق میں نہیں تھے، بہر حال جو بھی مشاعرہ ختم ہونے کا اعلان ہوا سامعین نے ہتھراؤ شروع کر دیا، کافی ہنگامہ ہوا، پھر پولیس آئی۔ کسی طرح حالات پر قابو پایا گیا۔ ہم جب تک شریک مشاعرہ رہے ہمارا دل لب ڈب لب ڈب کرتا رہا۔ لیکن یہ ہنگامہ آرائی کے بعد تو لب لب، ڈبا ڈب وغیرہ وغیرہ کرنے لگ گیا اور بھی نہ جانے کتنے دلوں کی دھڑکن بے ترتیب ہوئی، کتنے لوگوں کا ہارٹ فیل ہوتے ہوتے بچا، یہ تو ہم نہیں جانتے ہاں اندازہ ضرور کر سکتے ہیں کیونکہ ہمارے ساتھ ہماری ایک شاعرہ دوست کی حالت نے ہمیں حواس باختہ کر دیا تھا، وہ بے چاری ہتھراؤ کیا جانیں، مجنوں کا دور تو رہا نہیں، اُنھیں معلوم نہیں تھا کہ ہتھراؤ سے کیسے بچنا چاہیے؟ وہ گھبرا گئیں جسم لرزنے لگا، پسینہ میں شرابور ہو گئیں، آواز بند اور ہونٹ خشک ہو گئے اشارے سے ہمارا ہاتھ لے کر اپنے سینے پر رکھا جہاں ہمیں زلزلے کا احساس ہوا کیونکہ زلزلہ سے زمین کے اندر کی برت باہر اُلٹ آتی ہے۔ ہم گھبرائے کہ ہمیں ان کا دل نہ باہر نکل آئے کیونکہ وہاں لب ڈب کے بجائے دھڑام، دھڑام ہو رہی تھی، ہم اُنھیں کسی طرح گھسیٹ کر کارتک لے آئے اور انھوں نے اپنے آپ کو گاڑی کی سیٹ پر یوں گرا دیا کہ ہم تو سمجھے خدا نخواستہ.....

ان کی صاحبزادی چلائے جا رہی تھیں حالانکہ خطرہ ٹل چکا تھا مگر صاحبزادی کی چیخوں کا سائرن جاری تھا۔ بڑی مشکل سے ہم نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ کر دیوچا، اور اپنے ہاؤسیڈ پر بیٹھا لیا، پھر ان کو ان کے گھر چھوڑتے ہوئے

ہم واپس چلے آئے

بڑے مشاعروں میں کبھی ایسا ہو ہی جاتا ہے۔ کسی کونے سے نعروں یا سیٹی کی گونج عام بات ہے لیکن چھوٹے مشاعروں میں ایسے اثرات کم ہوتے ہیں۔ اردو کی بقاد کے لئے جلسے، مشاعرے، سمینار کا رواج عام ہو گیا ہے لیکن بد ذوق سامعین کی کس طرح اصلاح کی جائے؟ سمجھ میں نہیں آتا۔ ہمارا خیال ہے کہ ایسا کوئی دستور بنایا جائے کہ مشاعرے میں شرکت سے پہلے ہر شخص کو کارڈ یا نوٹ سے معائنہ کروا کر آنا چاہیے کیونکہ لب ڈب تک تو معاملہ ٹھیک ہے۔ سمجھ لیجئے کہ صاحبِ ذوق ہیں اور دل کی آواز بالکل نارمل ہے۔ اگر بے ترتیب لگے تو انھیں اپنی ای۔سی۔ جی رپورٹ پہلے متعلقین کے پاس بھجوانی ہوگی۔ اگر وہ پاس کر دیں تو شرکت ہو سکے گی ورنہ نہیں۔ منتظرین میں خاص طور پر ایک ”ماہرِ دل“ ڈاکٹر ہونا ضروری ہے۔ شاعروں کے دل میں یوں بھی مشاعرے ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن وہاں پتھر او نہیں ہوتا اور نہ ”لب ڈب“ جیسی کوئی آواز ہوتی ہے فقط شاعر کی آواز ہوتی ہے یہ لب ڈب تو ان کی نظر میں واہمہ ہے ان کے پاس دل کی اہمیت ہے دل کی آواز کی نہیں لیکن اسی دور میں دل کی آواز بڑی اہمیت رکھتی ہے اس سے رفت و زندگی کا اندازہ ہوتا ہے اور گردشِ ایام کا بھی، ڈاکٹروں کا بھی یہی دعویٰ ہے کہ لب ڈب، لب ڈب، اگر ہوتی ہے تو سمجھ لیجئے دل کے حالات بڑے سازگار ہیں۔ اگر یہ لب لب لب ہو تو پھر سمجھ لیجئے دل کے حالات بڑے سازگار ہیں اگر یہ لب لب لب ہو تو پھر سمجھ لیجئے سنگینی حالات کی مئے سے ساغرِ دل بھر چکا ہے اور چھلکنے ہی والا ہے تو اس سے پہلے کہ ہمارے دل سے کوئی تیغ سی گونجے، کوئی شور نہ اٹھے — ہم آپ سے اجازت چاہتے ہیں لب ڈب! لب ڈب! لب ڈب!

”دورِ زماں ہمارا“

کچھ بات ہے کہ ہستی شتی نہیں ہماری
حد یوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

ہاں! کیا یہ سچ نہیں کہ زمانہ ہم خواتین کا زمانے سے دشمن ہے؟
حالانکہ خواتین ہی کی بدولت زمانے میں رونق ہے۔ اگر ہم خواتین نہ ہوں تو یہ
”زمانہ“ بھی اپنا بورپر بستر گول کر جائے گا..... ہے نا!

شمال کے طوطے پر سب سے پہلے گھر کے ماحولی کو ہی لیجئے۔ وہ گھر، گھر ہی
کہاں ہوتا ہے جہاں ”خاتون“ جیسی کوئی ہستی نہ ہو۔ دنیا بھر کی بد نظمی اُس چھل
دیواری میں نظر آتی ہے۔ صاحب کے میلے کپڑے بکھرے ہوئے، ایک پاؤں کا
جوتا، دوسرے پاؤں کی چپل، پُرشکن بستر کے پاس ہی پائے جاتے ہیں۔
(کیوں؟ یہ آپ سمجھے نا!) پائے کی پیالی طشتری سے کافی دور جس میں
”پلٹھٹ“ جمی ہوتی ہے ”تفافل“ کا رونا روتی نظر آتی ہے۔ پُرانے اخبارات
کے ڈھیر پر ”منوں“ دھول جمی ”صحافت“ کا ماتم کرتی نظر آتی ہے۔ اگر صاحب
عام آدمی ہوں تو اور اگر خیر سے شاعر یا ادیب ہوں تو یہ بوجھنا ہی کیا
سارا خانہ خراب ہوتا ہے، بے سرو سامانی، قافیہ تنگ ہونے کا اعلان کرتی ہے
ٹوٹے پھوٹے قلم اور کچھ ادھوری تحریروں کے بوسیدہ صفحات اس لائبریری کی

یاد دلاتے ہیں جو ناقدری کا صدیوں سے سامنا کرتی آئی ہو !

کچھ اخباروں ، رسالوں کے تراشے اور ماضی کی دھندلائی ہوئی تصویریں بھی منہ پڑاتی نظر آتی ہیں۔ دیواروں پر رنگ و روغن تو نہیں رہتا البتہ کچھ ناموں کے ساتھ کچھ جملے۔ مثلاً "کے نام" "کے نام" "کے لئے" "کے بغیر" وغیرہ وغیرہ کچھ ابخانے خطوط بھی ٹوٹی پھوٹی میز پر پائے جاتے ہیں جن میں "ناقابل اعتبار" باتیں بڑے اہتمام سے لکھی ہوتی ہیں۔

شاعر و ادیب حساس ہوتے ہیں نا ! اس لئے ان کے پاس کتابیں ان کی ہوں یا کسی اور کی اس میں "تسلیموں کے پیر" اور سوکھے ہوئے پھول تو یقیناً مل جاتے ہیں۔ اگر صاحب "لازم سرکار ہوں تو پچھلے جوتے اور استری کئے ہوئے کپڑے نامکمل ہینگروں پر نظر آ رہے ہوں ، زیادہ تران کی میز پر ایسے کاغذ ہوتے ہیں جن پر مختلف حسابات لکھے ہوتے ہیں ، ان کے لئے ہر روز "روز حساب" ہوتا ہے۔ ایک ٹائم پیس ان کے جھولے ناپائنگ کے پاس ضرور ملے گی جو انھیں اپنے "مکرت الارم" سے سویرے جگانے کا کام کرتی ہے۔ ایک جھاڑو بھی پائنگ کے نیچے آپ کو ملے گی جو کبھی چھٹی کے دن صاحب گھر کی صفائی کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ حمام میں ایک بالٹی میں کپڑے ضرور بھر دھوئے ہوئے رکھے ہوتے ہیں۔

خمیر ! اب صاحبوں کی کئی قسمیں ہیں ، کتنی گنوائیں ! اب اگر عام جیسے صاحب ہوں اور ان کے گھر میں خاتون ہو تو بجائے کی پیالی طشتری سلیقے سے رکھی نظر آئے گی ، جوتا جوتے کے ساتھ اور چپل چپل کے ساتھ ہی ملیں گے۔ پرانے اخبارات ترتیب سے رکھے ہوئے ملیں گے جس پر دھول بھی کم سے کم نظر آئے گی

بستر پر نشاں تو قلماً نظر نہیں آتا۔ بجیہ کے غلاف پر پھول بھی یقیناً بنے ہوتے ہیں، ہے نا؟

شاعر و ادیب کے گھر میں ٹوٹے ہوئے قلم نہیں، تلوار کی طرح چلنے والے قلم ملیں گے بشرطیکہ "خاتون" موجود ہو۔ اخباروں، رسالوں کے تراشے فائل میں لگے ہوں گے مگر انجانے خطوں کا میز پر پایا جانا ممکن نہیں، بھلا نا قابل اعتبار تحریروں پر کہیں اعتبار کیا جاسکتا ہے۔۔۔۔۔؟ کتابوں میں رکھی تتلیوں، پھولوں میں اضافہ ہی ہوتا ہے، کمی نہیں ہوتی۔

اگر ملازم سرکار صاحب بھی "صاحب خاتون" ہوں تو نقشہ وہی رہے گا بہت کم تبدیلی نظر آئے گی کیونکہ خاتون بھی شانہ بہ شانہ صاحب کے ساتھ دفتر جاتی ہے نا، اور دفتر کے نظام کو درہم برہم ہونے سے ہمیشہ بچانے کی کوشش میں خود کو الجھائے رکھتی ہے۔ مگر خدا معلوم آج کل ماحول میں خواتین سے "تعصب" کیوں اتنا بڑھ گیا ہے کہ اس کی اہمیت کو "صاحبان" گھٹانے کی کوشش میں خود اپنی قدریں گھٹائے جا رہے ہیں، قدر تو ساتھ دینے سے بڑھتی ہے، انجان ہونے سے نہیں خواتین "نظام عالم" کا سب سے اہم دستور ہیں جس کی اہمیت سے صاحبان لاکھ انکار کریں مگر حالات شاہد ہیں۔

زندگی کے خالق ہم، زندگی کے مالک ہم
ہم نے اپنے سانچے میں زندگی کو ڈھالا ہے

ہے نا —

”ہنستے رہتے“

اب اتنا زیادہ بھی ہنسنے کی ضرورت نہیں کہ آپ ہر وقت منجھن فاروقی کا اشتہار نظر آنے لگیں۔ ہم نے یہ مشورہ اس لئے دیا ہے کہ آج کل ہنسنا معیوب سمجھا جانے لگا ہے۔ خاموش رہنا یا منہ بسورتے رہنا فحش ہے، مسکراہٹ بھی شاذ و نادر ہی گوارا کی جاتی ہے۔ خوش اخلاقیوں کے موسم گزر گئے، اب یہاں صرف ”جلے منہ“ رہتے کا دور..... مگر ہم اُس دیشی کے واسطے ہیں جس دیش میں گنگا بہتی ہے..... جہاں پر گنگا کی لہریں مسکراتی کھلکھلاتی رہتی ہیں، جہاں کے کنارے شان سے مسکراتا تاج محل، چاندنی راتوں میں جگمگاتا رہتا ہے۔ یقین کیجئے دل کھول کر قہقہے لگانا سب کے نصیب میں نہیں ہوتا۔ یہ صرف زندہ دل لوگوں کو ہی میسر ہے۔ ہنستے مسکراتے رہنے سے حیات بڑھتی ہے۔ رگوں میں منجمد ہو جانے والا لہو بھی ہنسی کے ارتعاش سے متحرک ہو جاتا ہے اور تجدید حیات ہونے لگتی ہے۔ مزاحیہ مضامین (ناچیز کے بھی) لطیفے برجستہ اور شائستہ مذاق یقیناً آپ کو ہنستا مسکراتا رکھے گا۔

ہماری ایک دوست ہیں، وہ اکثر طنز و مزاح کے مضامین بڑھتی رہتی ہیں اور تمہاری قہقہے لگاتی رہتی ہیں۔ کئی بار اُن کے گھر والے دماغی ڈاکٹر کے پاس لے گئے لیکن ڈاکٹر نے انھیں ”خوش مزاج“ کہہ کر لوٹا دیا۔

مختلف مسائل انسان کے ذہن میں ہوتے ہیں۔ ذرا ہنس لینے سے طبیعت بہل جاتی ہے اور پھر آپ خود میں نئی توانائی محسوس کرنے لگتے ہیں، ہے نا ؟
 عیبوں کے ہنر بن جانے کا دور تو آپ دیکھ ہی رہے ہیں، راستہ چلتے ہوئے
 ہر کوئی مگر جائے تو اس پاس کے لوگ تہقہ لگاتے ہیں، بھائے اس کے کہ گرنے
 والے کو اٹھایا جائے۔

آپ اگر خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے کیلئے کسی محفل میں مسکرا کر چائے تو
 آپ کی مسکراہٹ ایسی نظر آتی ہے جیسے کہ آپ کے پاؤں میں کیل پیچھے گئی ہو اور
 آپ تکلیف سے آہ کرنے والے ہوں !

ہم نے آپ کو ہنسنے کا مشورہ تو دے دیا لیکن اس کے طریقے ہمیں بتائے
 دیکھئے جب کوئی آپ سے تپ کا نام پوچھے نا، تو ہنستے ہوئے نام بتا دیجئے۔

پہلے چھنے والا بھی ہنس دے گا (متحیر ہو کر) اگر آپ کی خیر و عافیت پوچھی جائے تو پہلے
 زور دار تہقہ لگائیے، پھر کہئے ”اللہ کا کرم ہے“ سامنے والا اور بھی حیران ہو گا۔
 (آپ کی دماغی حالت پر شک بھی کرے گا)

مزید تفصیلات کوئی پوچھے تو مسلسل تہقہ لگاتے جائیے اور سناتے جائیے
 دیکھئے کہ مقابل پر کیا لگتی ہے ؟

کبھی کسی کی عیادت کے لئے جانا ہو تو بہر عیادت تہقہوں کی بارش کیجئے جب
 ملک کہ دوا خانے کا عملہ آپ کو روم سے باہر نہ کر دے۔

اگر خدائے کرے کسی کی تعزیت میں جانا ہو تو پہلے حسب روایت آئندہ ہائیے پھر
 صبر کی تلقین کیجئے۔ پھر ذرا دیر چپ ہو کر ہلکے سے مسکرائیے۔ اس کے بعد صحت و عیادت

پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ شعر پڑھئے۔

قید ہستی سے کب نجات جگر
موت آئی، اگر حیات گئی

اور پھر بے ساختہ یوں ہنس پڑیئے جیسے آپ زندگی پر ہنس رہے ہوں۔ اگر صاحب خانہ آپ کا ساتھ دے تو ٹھیک ہے ورنہ چپکے سے کھسک جائیئے۔۔۔۔۔! کسی شادی خانہ آبادی میں تو آپ کو پوری آزادی ہے کہ جی بھر کے قہقہے لگائیں اور زور زور سے لگائیں تا وقتیکہ آپ کے ہونٹوں پر لگی "لپ اسٹک" آپ کے رخساروں تک پہنچ جائے۔ کاجل لگی آنکھوں میں ہنسی خوشی کے فوارے پھوٹنے لگے آپ کی ہنسی کو نہیں رکننا چاہیئے، لیکن سلامی دیتے وقت خدارا نہ ہنسے گا ورنہ لوگ سمجھیں گے کہ۔۔۔۔۔

کبھی دلہن کی وداعی تقریب کے وقت جب دلہن کے قریبی عزیز زار روئے لگیں تو آپ دلہن کے تابناک مستقبل کی پیش قیاسی کرتے ہوئے فراخ دلی سے اس طرح قہقہے لگائیے کہ روتی ہوئی دلہن بھی ذرا دیر ہنسنے پر مجبور ہو جائے۔۔۔۔۔! ایک بار کہیں جاتے ہوئے ہمیں نہ جانے کیا یاد آگیا کہ ہم بے اختیار ہنس پڑے۔ ہم اس وقت پیدل تھے بالکل پیدل، ہماری ہنسی رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی (ہم خیالوں کی دنیا میں رہنے والے جو ٹھہرے) کچھ آگے جانے کے بعد ہمیں آگے راستہ تنگ سا محسوس ہوا۔ ہم ٹھٹک کر رُک گئے۔ کچھ منچلے لڑکے، لڑکیاں ہمارے آگے پیچھے شور مچا رہے تھے، وہ ہمیں یا گل سمجھ رہے تھے ہں کے باوجود ہماری تاملاد، ہنسی رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی، ہم نے کئی آٹور کشاد کے مگر ہم دیکھتے ہی آٹو والے بھی تیزی

سے گزر جانے لگے کہ شاید ہم مذاق نر رہے ہوں۔ بڑی مشکل سے ایک آٹو ہمارے اشارے پر رکا، ہم آٹو میں بیٹھ گئے۔ اب کسی حد تک ہماری ہنسی کم ہوئی۔ کچھ آگے جا کر آٹو والے نے تھقبے لگانے شروع کیے۔ ہم نے وجہ پوچھی، تو اُس نے جواب میں اور زور سے تھقبے لگانے شروع کیے۔ ہم نے پوچھا تو اُس نے اور زور سے ہنسنا شروع کیا۔ ہم پریشان ہو گئے۔ آٹو والے کے سر پر زخموں کے پرانے نشان تھے اور علیہ پاگل خانے سے بھاگ نکلنے والوں کا ۔۔۔۔۔ !

اس پریشانی کے عالم میں ہم نے چلتے ہوئے آٹو سے چھلانگ لگا دی۔ ہم زخمی ہوئے یا نہیں۔ یہ آپ خود سمجھ جائیے۔ مگر ہم ہنسنے والوں سے ابھی تک گھبراتے ہیں۔ اُس پاگل آٹو رکشا والے نے ہمیں سمجھا دیا کہ بے وجہ ہنسنے کو پاگل پن کہتے ہیں اور اس لئے ہم کسی آٹو میں ابھی تک نہیں بیٹھے۔ مگر ہنسنے ضرور ہیں، گھر میں یا کبھی تنہائی میں ہنس کر "تجدید حیات" کر لیتے ہیں، کیا کریں سر عقل ہنسنا معیوب سمجھا جاتا ہے نا۔۔۔ ؟



”نیت ہماری.....“

ہمیں اس بات پر بہت ناز ہے کہ ہم بہت گہری نیت سوتے ہیں۔ ہم عام لوگوں کی طرح ”سر سراپٹ“ سے جاگنے والوں میں نہیں، بلکہ ہم تو ان بے جگر لوگوں میں سے ہیں جو نکسلا ٹکس اور پولیس کی گولیوں اور بموں کے دھماکوں کے درمیان بھی سوئے رہتے ہیں۔ دھماکے ہمارے نزدیک اہمیت نہیں رکھتے۔ اونہم، یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ رات کے سناٹے میں کوئی زور دار آواز سن کر گھبرا کے اٹھ جائیں اور سارے گھر والوں کو پریشان کر ڈالیں اور اتنی ذرا سی بات پر خوابوں کے حسین نگر سے دوڑے چلے آئیں۔

ہمارے پاس نیت بڑی فرصت سے آتی ہے اور وہ خوابوں کے رنگین پتار سے کئی خواب نکال کر ہمیں دیتی ہے اور ہم ان خوابوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے میں مٹھمک ہو جاتے ہیں۔

ان خوابوں کے دامن رنگ برنگے ستاروں سے آراستہ ہوتے ہیں۔ ہم ستاروں کی اس خاموش دنیا میں بڑے سکون سے جے رہتے ہیں جہاں روشنی دبے پاؤں چلتی ہوئی ہمارے قریب آجاتی ہے اور ہم روشنی کو دستک دے کر دوبارہ آنے کی تاکید کر کے رخصت کر دیتے ہیں۔ خاموشیوں کو توڑتی، اندھیروں کو چیرتی صبح ہمیں جگا دیتی ہے مگر ہم رات کے فسوں سے پھر بھی پیچھا نہیں چھڑا پاتے اور پھر

یہ ہوتا ہے کہ مسلسل گھروالے سوال کرنے لگتے ہیں کہ آخر ہم ایسی نیند کیوں سوتے ہیں کہ حالات کی خبر ہی نہیں ہوتی ؟

ایک دفعہ ہمیں بتایا گیا کہ بازو کے میدان میں رات کو تعمیر کے لئے برما لگایا گیا تھا، کئی زوردار دھماکوں سے آس پاس کی بلڈنگیں دہل گئیں، لوگ "زلزلہ" سمجھ کر باہر نکل پڑے لیکن ہم سمجھے کہ "اوائے بے نیازی" سے سوتے ہی ہے اس وحشت میں بھلا کون کسے پوچھتا ہے ؟ جب دھماکوں کی اطلاع پولیس اسٹیشن تک پہنچی تو پولیس نے آکر وہ دھماکے رکوا دئے اور لوگوں کی جان میں جان آئی۔ جب ہماری تلاش شروع ہوئی تو ہم اس ہجوم میں نہیں پامے گئے۔ کسی نے واپس ہمارے بیڈروم میں آکر ہمیں دیکھا، ہم دھماکوں کے ارتعاش سے اپنے پلنگ کے نیچے گر پڑے تھے لیکن نیند نہیں ٹوٹی تھی۔ گھروالے یہ سمجھے کہ ہم "گزر گئے" ہلکی ہلکی سیکیوں کی لہریں زوردار پچکیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ ہم نے پھر بھی جنبش نہیں کی، نہ جانے کب ہمیں ہال کے وسط میں اٹھا کر رکھا گیا۔ کسی "جہان نیدہ" نے ہماری نبض اور دل کی دھڑکن محسوس کی اور نعرہ بلند ہوا کہ "ہم زندہ ہیں"۔ ہمارے گھر میں خوشیوں کے دریا ابل پڑے۔ روتے چہرے مسکراتے لگے۔ ہمیں بچوں نے دیوچ لیا کہ ہم واقعی "گزر" نہ جائیں، منہ پر خجبت سارا ٹھنڈا پانی اُنڈیا تو ہم جاگے، سب تالیاں بجا رہے تھے جیسے کہ ہم نے "موت کے کنوئیں" میں چھلانگ لگا کر کوئی کرتب دکھایا ہو، لیکن واقعی کرتب دکھانے کی گھڑی تو اب ہمارے سر پر تھی، ہمیں مردہ سمجھ کر ہمارے پاؤں کے انگوٹھے باندھ دیئے گئے تھے ہم نے اُٹھ کر چلنے کی کوشش کی تو دھڑام سے اونڈھے منہ گر پڑے۔۔۔

توبہ، توبہ ہماری جیسی ہستیاں گرنے کے لئے نہیں بنائی جاتیں، اسے ہم تو وہ چیز ہیں جس سے پہاڑ بھی ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ ہا سٹے، ملکہ مہراج ہم اوندھے منہ گر پڑے تھے اور گر کر اٹھ بھی نہ سکے۔ ہماری ناک سے خون بہہ رہا تھا ہمارا منہ زخمی ہو گیا تھا، کیونکہ دانت بھی اپنے تھے اور ہونٹ بھی اپنے۔۔۔۔۔! غیر پاؤں کے انگوٹھے کھول دیئے گئے، ہم "شتر بے چار" کی طرح اس عمر رسیدہ خاتون کی طرف پلکے جن کی قیاس آرائی نے ہمیں مُردہ قرار دیا تھا وہ خاتون گھبرا کر حمام میں جا گھسیں اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ ہم نے جوش میں پلٹا کھایا تو ٹکرا گئے اپنے نامدار سے۔۔۔۔۔ ہمارے بالوں کو انھوں نے مٹھی میں پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے سخت لہجے میں کہا، "ہوش میں آؤ۔۔۔!" یہ جملہ بالوں کی گرفت سے زیادہ طاقتور تھا۔ ہم واقعی ہوش میں آ گئے، کیونکہ گھر کے سب چھوٹے بڑے افراد ہمارا مذاق اڑا رہے تھے اور ہم اپنے بال اپنے۔۔۔۔۔ نامدار سے چھڑانے کی کوشش میں مرے جا رہے تھے۔

خدا خدا کر کے حالات موافق ہوئے۔ دو تین گھنٹے بعد دھماکہ جیسی آواز نے ہمیں چونکا دیا (ہم جاگ رہے تھے نا! اس لئے)۔ حمام میں بند ہونے والی خاتون کافی دیر سے دروازہ پیٹ رہی تھی۔ ہم نے غصہ میں اس وقت دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔ بہر حال جب دروازہ کھولا گیا تو وہ پسینہ میں شرابور ہمارے اوپر ہی آپڑیں اور بے ہوش ہو گئیں۔ ہم دل ہی دل میں خوش ہوئے کہ اس خاتون سے انتقام لے ہی لیا جس نے ہمیں "مردہ" قرار دیا تھا۔ اگر واقعی ہمیں مُردہ سمجھ کر "زندہ درگور" کر دیا جاتا تو ہم آج آپکو اپنی نیند کے بارے میں کیسے بتا سکتے؟ ہے نا۔۔۔۔۔

”ہنسی آتی ہے“

دیکھئے صاحب! ہم کوئی تجوری و جوری نہیں رکھتے۔ نہ ہم ساہوکاروں کی طرح بڑی بڑی فولادی الماریوں کے مالک ہیں۔ نہ ہم نے گھر کے آئین یا دیواروں میں سونے کی انشٹیس دفن کر رکھی ہیں، پھر بھی ہم اعلان کرتے ہیں اور باہوش و حواس اعلان کرتے ہیں کہ ہم بہت مالا مال ہیں۔ یقیناً آپ کا تجسس بڑھ گیا ہوگا کہ آخر ہم مالدار کیسے ہیں؟ تو سنئے! ہم نے اپنے وجود میں بے شمار قیمتی پتھیا رکھے ہیں۔ جب ہمارا جی چاہتا ہے ہم انھیں بچھاؤ کرنے لگ جاتے ہیں مگر یہ ہم اُس وقت کرتے ہیں جب کوئی غمِ دوراں یا غمِ جاناں کی ماری ہستیاں نظر آئیں۔ ہم انھیں اس قدر ہنسا دیتے ہیں کہ وہ روتے روتے ہنس پڑتے ہیں اور یہ ہنسی کا تسلسل کچھ اتنا طویل ہو جاتا ہے کہ کبھی کبھی طبقہ امرا کی ضرورت بھی پوری ہوتی ہے۔۔۔۔۔ اب آپ حیران ہو رہے ہوں گے کہ بھلا ہنسانا بھی ایسا کون سا ہنر ہے جو ہم اتنا ناز کر رہے ہیں؟

بات دراصل یہ ہے کہ جب کوئی حزن و ملال یا جہرے پر طاری کئے، ہم سے ملتا ہے تو ہم پر ایک عجیب طرح کی کیفیت ہماری ”چھٹی حس“ ہم پر سایہ کر دیتی ہے اور ہم اُس کیفیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں جسے ڈاکٹر اختلاج اور بزرگ ”ہول دلی“ کہتے ہیں۔ ہم یہ ٹھکان لیتے ہیں کہ اس موذی مرض کا علاج ہم

خود کریں گے، ہم اپنے آپ کو خوش کرنے کے لئے دوسروں سے "لطیف بازی" جیسی گفتگو کرنے لگتے ہیں، جب مقابل ہنستے ہنستے بے قابو ہونے لگتے ہیں تو ہمارے دل کو بڑا چین آ جاتا ہے، "ہول دلی" اطمینان میں بدل جاتی ہے۔ اور ہم اور ہمارے مقابل باغ و بہار قبچھے لگاتے ہوئے حزن و ملال کے "اسب" کو بھٹکا دیتے ہیں اور غفل کو قبچھے زار کر دیتے ہیں۔ ہمارا یہ خیال ہے کہ اس طرح "تجدید حیات" کرتے رہنے سے بالآخر ہم غمِ خفر بھی حاصل کر ہی لیں گے۔ ہم اس مصرعہ کے قائل ہیں کہ

"زندگی زندہ دلی کا نام ہے"

ہمارے پاس ہنسی کا سامان بہت ہے۔ اگر ہم اس کی تجارت شروع کر دیں تا! تو یقین کیجئے، دنیا کی سب سے بڑی "تاجر ہستی" کھلائیں گے۔ ہم نے کئی بار اس تجارت کی کوشش کی لیکن خدا بھٹا کرے خود غرضوں کا، خود تو ہم سے قبچھے لے لیتے ہیں، اور ہمیں آنسو دے ڈالتے ہیں۔ ہم چونکہ مسکراتے رہنے کے عادی ہیں، آنسو ہمارے چہرے سے میل نہیں کھاتے اور ہمارے چہرے کے خدو خال متفرق ہو جاتے ہیں، یعنی ہونٹوں پر ہنسی بھی رہتا ہے تو آنکھوں میں دوسروں کے آنسو، ہم بڑے مضحکہ خیز نظر آنے لگتے ہیں۔ اتنے زیادہ کہ ہمارے گھر والے بھی ہمیں پہچان نہیں پاتے ہمیں اپنی پہچان کے لئے باتو آنسو روکنے پڑتے ہیں یا ہنسی۔ آنسو دوسروں کے ہوتے ہیں جن پر ہمارا قابو نہیں، ہنسی ہماری ہوتی ہے مگر اکثر بغاوت کر جاتی ہے۔ ہماری مجبوری پر بھی آپکو یقیناً ہنسی آرہی ہوگی کہ ہم ویسے تو باتیں بڑی بڑی کرتے ہیں مگر قابو ذرا بھی نہیں۔ اسکی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم اکثر اپنے قصور میں "زعفران" کے کھیت خود کو چھل قدمی کرتا ہوا پاتے ہیں۔ اگر آپ بھی

ہنسی کی قیمت

ہماری یہ عادت ہے کہ جب ہم اپنا کوئی افسانہ، مضمون یا غزل سُنا تے ہیں تو بہت ہی سعادت مندی سے سُنا تے ہیں یعنی سر جھکا ہوا، نظریں نیچی اور کچھ کچھ گھبرائے ہوئے سے، اس سعادت مندی کی اصل وجہ آپ سن کر حیران ہو جائیں گے۔ ہماری کمزوری یہ ہے کہ سُنا تے وقت ہماری نظر اگر کسی چہرے پر پڑ جائے تو اسے محو حیرت دیکھ کر ہمیں بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے اور اتنی بے ساختگی سے آتی ہے کہ ہمارے چہرے پر پڑا ہوا سنجیدگی کا دبیز نقاب تار تار ہو جاتا ہے۔

”سرسوں پھولنے“ کے بعد کی کیفیت تو آپ جانتے ہوں گے نا!

ہماری ہنسی پر ہمارا قابو ہی نہیں، ہمیں خبر ہی نہیں ہوتی کہ ہنسی کب ہمارے چہرے سے عیاں ہو جائے۔ محفلوں کا لحاظ کئے بغیر یہ کم بخت نہ جانے کیوں ہمارے ہونٹوں پر کھیلنے لگتی ہے۔ اپنے برابر کے لوگوں میں تو بیٹھ جاتی ہے لیکن جب بڑوں کے سامنے یہ کم بخت ہنسی رکنے کا نام نہیں لیتی تو ہماری شامت ہی آجاتی ہے ہم ایک بار اسے مرض سمجھ کر اپنی عقل مندی کا ثبوت دینے کے لئے ایک ”ماہر نفسیات“ کے پاس پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب کو سلام کرتے کرتے ہم نے ایک نظر بہ خدا صرف ایک نظر اُن کو دیکھا۔ ”اے وحشت دل کیا کروں؟“ کا خلیہ لئے ہوئے وہ کچھ اس طرح ہماری جانب دیکھ رہے تھے کہ ہم قہقہہ مار کر ہنس پڑے اور

ہنست ہی چلے گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے نام پوچھا، ہم کچھ بتانہ۔ کیسے۔ ہمارے پاس جواب میں تہمت تھے صرف، تہمتیں۔۔۔۔۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے ہم سے پوچھا، شکایت کیا ہے؟ ہم نے دل میں سوچا شکایت؟ وہ تو ہمیں کبھی کسی سے نہیں رہی، مگر جواب نہ دے سکے۔ ہمارے منہ سے ہنسی کا فوارہ جاری تھا جس سے اب ڈاکٹر صاحب بھی بھینگنے لگے تھے۔ ہمارے تہمتیں اب فلک "شکاف" ہونے لگے تھے رفتہ رفتہ ڈاکٹر صاحب کے بھی دانت ہمیں نظر آنے لگے، باقاعدہ "جنگلی بندی" شروع ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب ہم پر اور ہم ڈاکٹر صاحب پر ہنستے رہے۔ تقریباً آدھا گھنٹہ یہی حال رہا، پھر معطر ام سے دروازہ کھول کر ایک صاحب اندر چلے آئے۔ پتلون کے تسمے اُن کے کانڈھے پر لٹکے تھے، چشمہ غالباً ناک کے لئے ہی بنوایا تھا، وہ کچھ سمجھے، کچھ نہیں سمجھے مگر ہماری ہنسی میں شامل ہو گئے۔

"مطب" "ہنسی خانہ" بن گیا، ہم پوری طرح ہوش میں تھے مگر یہ کہ ہنسی پر قابو نہیں پاسکتے تھے۔ ہم نے جانے کا ارادہ کر کے اپنے پرس سے سو روپے کا نوٹ "بطور فیس" ڈاکٹر صاحب کی طرف بڑھایا۔ ڈاکٹر صاحب بھی کچھ نہیں کہہ پا رہے تھے۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے نوٹ واپس لینے کو کہا اور اپنے کوٹ کی جیب سے سو سو کے دو نوٹ ہمیں ڈاکٹر صاحب نے دیئے تھے، ہم بنا کچھ کہے وہاں سے چلے آئے، نوٹ تو ہم پہلے ہی پرس میں رکھ چکے تھے لیکن اب ہماری ہنسی رگ گئی تھی ہم کافی سنجیدہ ہو گئے تھے۔ آج تک یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ ڈاکٹر صاحب نے فیس لینے کے بجائے ہمیں دی کیوں؟

ہم جب بھی ہنستے ہوئے یہ واقعہ یاد کرتے ہیں تو ہماری ہنسی رک جاتی ہے

ہور ہم زعفران کے کھیت سے نکل کر ستانت کے چٹیل میدانوں میں
 بھٹکنے لگتے ہیں، اور یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہنسی کی قیمت شاید
 دو سو روپے ہے یا پھر ہنسی ایسی متعوی بیماری ہے جو کسی کو بھی کسی
 وقت ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کے سارے جرائم ہمارے اندر ہی پائے جاتے ہیں
 جس کا علاج دو سو روپے ہے، وہ بھی اگر ماہر نفسیات ڈاکٹر دے تو !!



جب ہم اناؤنسر بن جائیں گے

جیسے ہی ہمیں یہ معلوم ہوا کہ دور درشن حیدر آباد سے اردو میں بھی خبریں نشری جائیں گی، ہم عالم خیال میں پرواز کرنے لگے۔ دراصل ہمیں خبریں نشر کرنا بہت پسند ہے اور بات جب اردو کی ہوتی ہے تو ہم بھی دل کی طرح خوشی سے بلیوں اُچھلنے لگتے ہیں۔

خیر چھوڑیئے، ہاں تو ہم نے سوچا جب ہم "اُناؤنسر" بن جائیں گے تو پہلے ہی ہمارے دوست و اقرباء کے علاوہ شہر کے بے حساب لوگ بھی ٹی۔وی کے سامنے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہمیں دیکھ رہے ہوں گے اور ہم گرما گرم خبریں نشر کر رہے ہوں گے۔ خبروں کی ترتیب بھی ہم ہی کریں گے۔ کبھی ہم ہم پھٹنے کی اطلاع دے کر ناظرین کو خوفزدہ کر دیں گے، کبھی درجہ حرارت کا اعلان کر کے لوگوں کو پسینے میں غرق کر دیں گے۔ کبھی سردی کی لہر کا احساس دلا کر اون کا کاروبار کھٹے والوں کا بھلا کر دیں گے، کبھی ہم بند کا اعلان کر کے نظام شہر درہم برہم کر دیں گے، کبھی ہم کسی سیاسی لیڈر کے اغواء کی خبر سن کر امن پسند شہریوں کو خطرے کا احساس دلائیں گے، کبھی وکیتی کی مسلسل وارداتوں پر تشویش کا اظہار کر کے لوگوں میں ہراسانی پھیلائیں گے۔ کبھی ہم کسی مذہبی جلوس کی خبر دے کر دلوں میں جوش و خروش پیدا کر دیں گے تو کبھی "ایرانڈیا" کے عملہ کلمہ پڑھتا ہوا تالی کی خبر دے کر بہت سی پروازیں روک دیں گے۔ کبھی ہم کسی نئی سرکاری عمارت کے افتتاح کی تاریخ مقرر ہونے کی اطلاع دیں گے تو کبھی شہر کی کسی بڑی شخصیت کے سانحہ ارتحال سے متعلق

خبر بادیدہ غم سنا کر ناظرین کہ بھی غم زدہ کر دیں گے۔ کبھی کسی ٹرین کے حادثہ کی خبر دے کر لوگوں کو پریشان کر دیں گے تو کبھی چاول کی قیمت کم ہونے کی خوشخبری سنا کر سب کو خوش کر دیں گے۔ سرکاری دواخانوں میں نئے طریقہ علاج کی مشین دکھاتے ہوئے مریضوں کی تسلی کا باعث بن جائیں گے تو کبھی سونے، چاندی کے بھاؤ کا ادبچہ بیچ سبھائیں گے۔ کبھی آنے والے طوفان کا پیش خیمہ کرتے ہوئے چھاؤ کی تدبیریں بھی سکھائیں گے۔ کبھی سورج یا چاند گہن کی پیش قیاسی کرتے ہوئے شہریوں کو مذہب پرستی میں مبتلا کر دیں گے۔ کبھی عید کی مبارکباد دیتے ہوئے شیر خورہ بنانے پر سب کو مجبور کر دیں گے تو کبھی دیوالی کی مبارکبادیوں کے چراغ روشن کروادیں گے۔ شہر کے تمام لوگ ٹی۔وی کے سامنے ہماری "شبیبہ" دیکھتے ہوئے عقیدت سے سر جھکا ئے ہم پر رشک کر رہے ہوں گے کہ ہم کتنی بڑی بڑی ذمہ داریاں آسانی سے سنبھال لیا کرتے ہیں۔۔۔۔۔

بے ناہ — ہمیں یہ اندیشہ بھی ہے کہ ہم خبریں سناتے ہوئے بوکھلا ہٹ کا شکار بھی ہو جائیں گے۔ لیکن یہ اعتماد بھی ہے کہ ناظرین و سامعین اپنی قابلیت سے ان لفظوں کو صحیح طور پر سمجھ لیں گے جنہیں ہم روانی اور بوکھلا ہٹ میں اُلٹ پلٹ ادا کریں گے۔۔۔۔۔ اناؤنسر بننے کی خواہش اپنی جگہ، لیکن دل کے اندیشے کس اندامت نہ بن جائیں، یہی سوچ کر ہم ابھی سے اناؤنسر بننے کا مشق کر رہے ہیں۔ ہم گھر کے ہر فرد کی بات کرنے لگے ہیں جیسے کہ خبریں نشر کر رہے ہوں۔ ملازمین ابھی پوری طرح ہماری اُردو سے واقف نہیں، اس لئے انہیں اپنی بات سمجھانے کیلئے عام بول چال کے انداز سے کام چلانا پڑ رہا ہے۔ ہمارے بچے امد ہمارے سرتاج تو اب ہماری قابلیت کا لوہا ماننے ہی والے ہیں۔ آپ بھی یقین کر لیجئے تاکہ "ہم اناؤنسر بن جائیں گے"۔

”بے محل“

جی ہاں! بے محل ہم خود ہیں۔ ہمارا محل وحل کچھ نہیں ہے لیکن ہمارے یہاں آنے والے شادی وغیرہ کے رقعوں پر ہم اپنے شوہر کے نام کے علاوہ جب ”محل“ لکھا ہوا دیکھتے ہیں تو ہمیں خود اپنے ”محل“ ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ اب یہی دیکھ لیجئے کہ ہم تاج ہیں، یا نا، اور پھر محل بھی ہیں نا؟ اس طرح ہم ”تاج محل“ ہوئے نا، یعنی ایک شاہی مزار۔۔۔ دراصل ہمارے اندر بہت ساری چیزیں دفن ہیں، کئی مضامین، مزاحیہ خاکے، کئی غزلیں، کئی افسانے وغیرہ، لیکن ہم جب کبھی ”گڑے مڑے“ اٹھاڑنے بیٹھتے ہیں تو مڑوں کے ڈھیر لگا دیتے ہیں اور ہمارا قلم انھیں زندہ کرنے لگتا ہے اور یہ قرطاس کے دامن پر خوش وضع ”حشرات الارض“ کی طرح ہر اٹنے لگتے ہیں۔

تاج محل کے نقش و نگار کی طرز تعمیر دنیا کے عجوبوں میں شامل ہے، لیکن ہم ابھی تک عجوبوں کی فہرست میں شامل نہیں ہو پائے کیونکہ بے محل ”تاج محل“ بنا دیا جائے تو کیا نقش و نگار سے اسے آراستہ کیا جاسکتا ہے؟ بالکل اسی طرح کیا ممکن ہے؟ ہرگز نہیں! لیکن ہم اس کوشش میں لگے ہیں کہ ہم اگر تاج محل کے بجائے تاج سمجھ جائیں تو بہتر ہوگا کیونکہ تاج کی اہمیت محل سے زیادہ ہوتی ہے، تاج جب تک سر پر نہ ہو محل بے محل ہوتا ہے۔ ہوتا ہے نا۔۔۔!



”لہجہ“

”لہجہ“ لفظوں کے اعتبار سے اہم نہ سہی، لیکن معنوں کے اعتبار سے بہت اہم ہے، بہت زیادہ اہم ہے، دیکھئے نا! آپ چاہے کسی سے بات کر رہے ہوں، بالمشافہ یا پردے میں، یا قون پر گفتگو ہو رہی ہو، لہجے سے ”مخاطب“ کے چہرے کے آثار چڑھاؤ بھی محسوس ہوتا ہے، ہے نا؟ ناگوار لہجہ، پُرخلوص لہجہ، تھکا ہوا سا لہجہ اپنے پن کا لہجہ، اجنبی سا لہجہ، نفرت کی بجلیوں سے کڑکتا لہجہ، محبت سے بھرپور آبشار کی طرح بہتا لہجہ، سوالیہ لہجہ، مغرور لہجہ، بے بسی کا لہجہ، شگفتہ لہجہ، سنجیدہ لہجہ، شوخ لہجہ، اب ہم کتنی قسمیں بتائیں لہجے کی؟ یاد رہی نہیں کہ ہم کن کن لہجوں کے ورپا پار کر چکے ہیں، ایک اور لہجے کے بارے میں بتادیں، وہ ہے کاٹ کھانے والا لہجہ.....! گھبرائیے نہیں اس کاٹ کھانے والے لہجہ سے آپ کو پیٹ میں انجکشن قلعی نہیں لینے پڑیں گے، بلکہ اس کاٹنے والے لہجہ کے نشان بھی جسم پر نہیں ہوتے، ہاں مگر مود کچھ زخمی ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹروں نے جسم کے سبھی زخموں کا علاج دیافت کر لیا ہے لیکن روح کے زخم وہ لوگ ابھی تک دیکھ نہیں پائے تو علاج کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے، ہے نا!

ہم اس کاٹ کھانے والے لہجہ کی اکثر زدیں آتے رہتے ہیں، مگر داد دیجئے صاحبان! ہمارے دفاعی ذہن کی۔ ہم اپنے مقابل کی طرف اسی طرح کے لہجہ کے

تیر چلتے ہیں اور استے چلتے ہیں کہ مقابل کا لہجہ آخر نرم ہو ہی جاتا ہے، اور ہم دل ہی دل میں خود اپنے لہجہ پر قربان ہو جاتے ہیں۔ ساحر لدھیانوی کا ایک شعر ہے۔

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا تھا وہ لوٹا رہا ہوں میں

ہم اسی شعر کے پوری طرح قائل ہیں اور ہم بھی اسی لہجہ کو اپنا لے رہتے ہیں، جس لہجہ کا ہمارا مخاطب عادی ہوتا ہے، روح کے زخم نظر نہیں آتے، اس لئے ہم اس کی فکر نہیں کرتے۔ ہاں! اگر کسی نے ہم پر گستاخانہ لہجہ کی رائفل تان لی تو ہم رعب دار لہجہ کے مزائیلوں سے کام لینا شروع کر دیتے ہیں، چاہے کچھ ہو ہم مزائل پر مزائل مارتے چلے جاتے ہیں۔ ویسے ہمارے پاس حاکمانہ لہجہ کے ہم، اور انتقامی لہجہ کے دبا بے بھی موجود ہیں جس کا ہم نے کبھی استعمال نہیں کیا، یہ تو ہم نے صرف اپنے دفاع کے لئے رکھے ہیں اور آپ کو بھی اطلاعاً کہہ رہے ہیں کہ ہم بھی بہت سے لہجوں کے ہتھیار رکھتے ہیں مگر خاکسارانہ لہجہ ہی سے کام چل جاتا ہے اس لئے دوسرے لہجوں کا استعمال نہیں کرتے — ٹھیک کرتے ہیں نا؟